March 2025

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

ISSN: 2581-9216

کرلیں اچھا کام کوئی جب ہمیں موقع ملے
ہاتھ سے موقع نکل جائے کہیں ایسا نہ ہو

زیر تعمیر عمارت مجوزہ نقشہ
شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے

www.shibliinternational.com

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

Issue: 85 :شمارہ Vol: 8 :جلد Mar 2025 مارچ

ISSN: 2581-9216

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابوہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ۔ پروفیسر مظفر علی شہہ میری

پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۔ پروفیسر ابوالکلام

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

مفتی محمد فاروق قاسمی ۔ مولانا ارشاد الحق مدنی

ڈاکٹر نادر المسدوسی ۔ الحاج سید عظمت اللہ بیابانی

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی ۔ اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق ۔ ڈاکٹر حمران احمد ۔ ڈاکٹر ناظم علی

ڈاکٹر مختار احمد فردین ۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری ۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی

ڈاکٹر سمیہ تمکین ۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی ۔ ڈاکٹر نوری خاتون

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی ۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد ۔

مولانا عبدالوحید ندوی ۔ مولانا احمد نور عینی

ابوہریرہ ایوبی ۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	**اپنی بات**	ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	غزہ کا مقتل اور مسلم حکمراں کی بے حسی	مفتی عمار احمد قاسمی	۷
۴	**غزل**	رہبر پرتاپ گڑھی	۹
۵	ظلم رہے اور امن بھی ہو؟ کیا ممکن ہے، تم ہی کہو؟	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۱۰
۶	**غزل**	طٰہٰ صدیقی	۱۲
۷	بلریا گنج کے بانکے لال سے مدینہ منورہ کے پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی ..	ذاکر اعظمی ندوی	۱۳
۸	ایک عظیم محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ	مفتی عبید اللہ شمیم قاسمی	۱۹
۹	**غزل**	انجنی کمار گوئل	۲۴
۱۰	بھول کو بزرگوں کی بھول ہی کہا جائے	عبدالغفار صدیقی	۲۵
۱۱	**غزل**	امیرؔ مینائی	۲۸
۱۲	سعید بن محمد نقش: ایک مایہ ناز مصور اور منفرد کر کا شاعر	ڈاکٹر نادر المسدوسی	۲۹
۱۳	کبیر داس: برہمنواد کا باغی اور محبت کا داعی	احمد نور عینی	۳۴
۱۴	**عید مبارک**	علی شاہد دلکشؔ	۳۷
۱۵	بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد، قوم وملت کے لئے فکر مند تھے..	ڈاکٹر مختار احمد فردین	۳۸

ماہنامہ ’’صدائے شبلی‘‘ کے خصوصی معاونین

جناب **ابوسفیان اعظمی**، مقیم حال ممبئی

جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی**، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

الحاج **سید عظمت اللہ بیابانی**، وجئے نگر کالونی، حیدرآباد

مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ

الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج **محمد زکریا انجینئر** (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چار مینار حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود**، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج **محمد قمر الدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج **محمد عبدالکریم**، صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

مارچ 2025ء میں رمضان المبارک شروع ہوا، اور حسن اتفاق اسی ماہ میں اختتام کو بھی پہنچے گا، پوری دنیا کے مسلمان رمضان المبارک میں روزہ، نماز، تلاوت، تراویح، ذکرواذکار، صدقہ وخیرات میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اپنے رب کو راضی کرنے کی فکر میں چہار جانب سے کوشش کرتے ہیں؛ کیوں کہ اللہ رب العزت نے اس ماہ میں فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر اور نفل کا ثواب فرض کے برابر قرار دیا ہے، جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے، رزق میں وسعت کردی جاتی ،قرآن مجید کے نزول کا مہینہ ہے اس وجہ سے ہر مسجد تلاوت ربانی سے منور ہوجاتی ہے، ایسے ماہ مقدس میں موجودہ حکومت ہند نے وقف ترمیمی بل لانے کا حتمی اشارہ کردیا ہے، مقدس ماہ میں دعائیں کی جارہی ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اور جمعیۃ علماء ہند کے اعلان سے کروڑوں کی تعداد میں میل بھیجے جارہے ہیں، میڈیا اور سوشل میڈیا پر وقف ترمیمی بل کے نقائص اور عیوب دلائل سے بتائے جارہے ہیں، مگر حکومت سب سننے کے لیے تیار نہیں ہے، اپنی ضد اور انا کے خاطر وقف ترمیمی بل پیش کرنے اور پاس کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

''وقف'' اللہ تعالیٰ کے نام پر زمین کو منجمد کرنے کا نام وقف ہے، اب اس زمین میں نہ وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت ہوگی، ہاں اس کے متولی ہوں گے جو املاک اور نفع کی حفاظت کریں گے اور واقف کے منشاء کے مطابق قوم وملت کو فائدہ پہنچائیں گے۔ ہمارے ملک میں مساجد، مدارس، درگاہیں، قبرستان، عاشور خانہ، یتیم خانہ، مسافر خانہ وغیرہ کے لیے ہمارے بزرگوں نے صدقہ جاریہ کے طور پر اپنی زمینیں وقف کی ہیں، عرصہ دراز سے لوگ وقف کی املاک سے فائدہ اٹھاتے ہیں، نظم ونسق کے لیے ہمارے ملک میں ریاستی اور مرکزی سطح پر شعبۂ وقف بورڈ قائم کیا گیا ہے، اکثر وبیشتر جو بھی سیاسی جماعت برسرِ اقتدار آئی اس نے اپنے پارٹی کے محبوب لیڈر جو کہ مسلمان ہوتے تھے وقف بورڈ کے بڑے چھوٹے عہدے پر فائز کردیئے۔ اگر سیاسی جماعت کا اقتدار بدلا تو وقف بورڈ کے اکثر وبیشتر ممبران بھی بدل جاتے ،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقف بورڈ کے ممبران کی مدد سے وقف کی قیمتی املاک پر بااثر لوگوں نے قبضہ کرلیا اور اپنی پارٹی کے خاطر وقف کی املاک سے سودا کرلیا اور ان وقف ممبران سے برسر اقتدار پارٹی وقف کی املاک پر سرکاری قبضہ کرنے لگی۔

سوشل میڈیا پر سابقہ منسٹر شاہ نواز حسین صاحب کی ایک ویڈیو وائرل ہورہی ہے، اس میں وہ کانگریس حکومت سے سوال کررہے ہیں کہ آپ جو سرکاری طور پر وقف کی زمینوں پر قابض ہیں اس سے دستبردار ہوجائیں تو مسلمانوں کی غریبی دور ہوسکتی ہے، ابھی قبضہ کے ہٹانے ہی کی بات ہورہی تھی کہ موجودہ حکومت نے ایک ایسے بل کو پاس کرنے اور کرانے کی کوشش کی کہ جس میں منشاء وقف کے خلاف باتیں ہیں جو ہمارے دستور اور مذہب کے خلاف ہے، اس وجہ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اور ملک کی تمام بڑی مذہبی اور سیاسی جماعتیں اس مسئلے پر ہماری ملّت کے ساتھ کھڑی ہیں، اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ ظالم کے ناپاک ارادوں کو ناکام کردے گا اور جو لوگ کوششیں کررہے ہیں اللہ تعالیٰ بہترین بدلہ دے گا۔

جو اصول گلستاں سے واقف نہ تھے
نظام چمن ان کے ہاتھ آگیا

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام ۳ سال تک رہا، ۱۳ نبوی میں آپؐ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھے، اہل وعیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء اور عائشہؓ کو لے آئیں، آنحضرت ﷺ نے بھی زید بن حارثہؓ اور ابورافع کو حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کو لانے کے لیے روانہ فرمایا، مدینہ میں آکر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتدادِ مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں، کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انھوں نے منھ دھویا، بال درست کیے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوئیں تو سب نے مبارک باد دی، چاشت کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانۂ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہلِ عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لیے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کے لیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا۔

وفات: حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ۹؍برس تک زندگی بسر کی، ۹ سال کی عمر میں وہ آپؐ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عائشہؓ قریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۷؍ہجری میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر ۶۶ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں،، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بنؓ ابی عتیق، عروہ بنؓ زبیر اور عبداللہ بنؓ زبیر نے قبر میں اتارا، اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپؐ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کیے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا، ان کے متعلق احادیث وسیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی: حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں، اکابر صحابہؓ پر انھوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں، جن کو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کردیا ہے، ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں، جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں، ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے، (ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال پیش آجاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں) ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب وانساب میں ان کو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک (ج ۴ ذکر عائشہؓ) میں اور ابن سعد نے طبقات (ج ۸ ذکر حضرت عائشہؓ) میں بہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے فضل وکمال کے دلائل وشواہد ملتے ہیں۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۳۲۵-۳۲۶)

مفتی عمار احمد قاسمی۔استاذ دارالعلوم حیدرآباد

غزہ کا مقتل اور مسلم حکمراں کی بے حسی

اس وقت پوری دنیا میں فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کا مسئلہ اُبھرا ہوا ہے اور ایک سُلگتا ہوا عنوان اور موضوع بنا ہوا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی پوری تاریخ اِس بات پر شاہد ہے کہ یہ کرۂ ارضی ابتدائے آفرینش ہی سے حق و باطل کی رزم گاہ رہی جیسے ہی مکہ کی سنگلاخ وادی سے اِسلام کی پہلی کرن طلوع ہوئی اور جیسے ہی اُس نے اپنی پرنور شعاؤں سے اِس جہاں کو منور کر کے عالم اِنسانیت کو ہدایت کا چراغ دکھایا اُسی وقت سے باطل پرستوں اور کفریہ طاقتوں کا ہجوم بھی اِسلام کی راہوں میں سدِسکندری بن کر نمودار ہوا، ہر دَور میں اِسلام اور چراغِ حقانیت کو بجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

آج بھی فلسطین کے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھایا جا رہا ہے اُس سے آنکھیں اَشکبار ہے، مسلمانوں کی زندگی سسک رہی ہے، مسلمان اپنی بے چارگی و بےبسی کے آنسوؤں کا سیلاب بہا رہے ہیں، غرض ایسا ظلم ڈھایا جا رہا ہے کہ اخبارات کا کوئی دن ایسا نہیں جس میں کفن میں ملبوس فلسطینی شہداء اور خون میں لتھڑے ہوئے بچوں کی آہیں سرخیوں میں نہ ہو۔ اسرائیل کے غزہ پر حملہ کرنے کے نتیجہ میں اب تک لاتعد و لاتحصی مسلمان شہید کر دیے گئے، جن میں بڑی تعداد خواتین اور کم عمر بچوں کی ہے، اور ایک بڑی تعداد زخمیوں کی ہے، اور جو مکانات منہدم ہوئے وہ بھی بے شمار ہیں، اِس تباہی اور بربادی کے باوجود مسلم حکمراں خاموش ہیں، یہ دراصل ایمان کی طاقت سے محروم ہونے اور اسلامی اُخوت کے جذبے سے خالی اور عاری ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں، تو پھر کہنے والوں نے کہا، کیا ہم اُس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم اُس وقت بہت ہو گے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کے مانند ہو گے، اللہ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا، اور تمہارے دلوں میں وہن ڈال دے گا تو ایک کہنے والے نے کہا: وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے۔

يُوشَكُ أن تَداعي عليكم الأمَمُ كما تداعى الأكلةُ على قصعتِها، قيل: يا رسولَ اللهِ أمِن قلةٍ بنا؟ قال: لا ولكنَّكم غثاءٌ كغثاءِ السيلِ تُنزَعُ المهابةُ من قلوبِ عدوِّكم منكم ويُوضعُ في قلوبِكم الوهنُ، قالوا: يا رسولَ اللهِ وما الوهنُ؟ قال: حبُّ الدنيا و كراهيةُ الموتِ. (رواہ ابوداؤد)

حالانکہ فلسطینی جنگ میں اسرائیل کے ساتھ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس، کناڈا وغیرہ کھلم کھلا موجود ہیں اور فلسطین کے ساتھ ایک مسلم ملک بھی نہیں ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اِس پوری اُمت کو ایک جسم بنا دیا تھا، ایسا جسد واحد جو ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہو۔ ایسے مربوط کہ ہاتھ کی انگلیاں ہی نہیں۔ بلکہ ناخنوں کے کاٹے جانے کی تکلیف بھی دوسرے حصہ کو بے چین کردے۔

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان آپسی محبت، رحم دلی اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ رکھنے میں ایک جسم کی طرح ہیں، اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم تڑپ اٹھتا ہے، اور وہ بے خوابی اور بخار سے دوچار ہوجاتا ہے، ترى المؤمنين فى تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد إذا استكى عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر. (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۶۰۱۱)

ایک اور موقع پر آپ نے مسلمانوں کی قوت وضعف کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ باہم ایک عمارت کی طرح ہیں، جیسے عمارت کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو طاقت پہونچاتا ہے اسی طرح یہ ایک دوسرے کے لیے طاقت کا ذریعہ ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں میں ایک دوسرے کو داخل کرتے ہوئے مزید تاکید کے ساتھ اسے سمجھایا۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۶۰۲۶) یعنی اگر کسی جسم کا کوئی عضو مفلوج ہوجائے اور وہ دوسرے اعضاء کی تکلیف کو محسوس نہ کرے، اگر کسی عمارت کا ایک حصہ پوری عمارت کا ساتھ چھوڑ دے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ جسم کتنا مجبور اور وہ عمارت کتنی کمزور ہوگی۔ یہی کمزوری ہے جو آج اس اُمت کے وجود میں گھن کی طرح لگ چکی ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ مسلمانوں یا کسی اور پر ظلم سے صرف اپنا دامن بچائے رکھیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت بھر ظلم ہونے کو برداشت نہ کریں اور مظلوموں کی مدد کریں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اُس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی اگر کسی مسلمان پر ظلم ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس سے آنکھیں نہیں موند لیتا المسلم أخوا المسلم لا يظلمه ولا يسلمه.

(بخاری شریف، حدیث نمبر: ۲۴۴۴)

ایک اور روایت ہے حضرت سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے سامنے کسی بندۂ مومن کو رسوا کیا جائے اور وہ مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اُس کی کوئی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کو تمام مخلوقات کے سامنے رسوا فرمائیں گے۔ (مسند احمد ۳/۴۸۷) یہ روایت تو ہر مسلمان کے لیے عبرت اور سبق آموز ہے، لیکن مسلمان حکمرانوں کو تو خاص طور پر اس کو اپنے لیے آئینہ بنانا چاہیے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کسی مسلمان سے اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور کرتے ہیں، من أقال مسلما أقاله الله عثرته (ابوداؤد: ۳۴۶۲)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کی ضرورت میں کام آنا مجھے اپنی اس مسجد (یعنی مسجد نبویؐ) میں اعتکاف کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ (طبرانی ۱۲/۴۵۳) مذکورہ روایتیں رسول اللہ ﷺ کی وہ سوغات ہیں جنھیں دل وجان سے قبول کرکے اُس پر عمل کرنا چاہیے، اگر بہت زیادہ

نہیں تو کم از کم اتنا ہی کر لیتے کہ تمام یہودی اور اسرائیل کمپنیوں کا بائیکاٹ کر دیتے، جن مسلم ملکوں کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات ہیں وہ اپنے تعلقات منقطع کر لیتے اور مغربی طاقت کے خلاف اپنا احتجاج درج کراتے تو انھیں فلسطینیوں پر ظلم وستم ڈھانے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

آج مسلم حکمراں کو فلسطینیوں کا خون نظر نہیں آرہا ہے، معصوم بچوں اور خواتین کی آہیں مسلم حکمراں کو سنائی نہیں دے رہی ہے، کیا شہیدوں کا خون مسلم حکمراں کی بیداری کے لیے کافی نہیں ؟ یا انھیں اور بھی انسانی لاشوں کے ڈھیر دیکھنے کا انتظار ہے، افسوس ان حکمراں کے آنکھوں پر جوان حقیقتوں کو بھی دیکھنے سے عاجز ہیں جنھیں شاید اندھے بھی دیکھنے سے محروم نہ ہوں۔ مسلم حکمراں کو قوت اور حوصلہ سے آگے بڑھنا چاہیے، یقیناً اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غفلت کی چادر اُتار کر آگے بڑھیں، تفریق وانتشار کے لیے کی جانے والی ہر سازش کو ناکام ونامراد کردیں، یاد رکھئے ایمان واتحاد ہی ہماری اصل طاقت ہے، اخیر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام امتِ مسلمہ بالخصوص فلسطین کے مسلمانوں پر رحم فرمائے۔

(آمین یارب العالمین)

☆☆☆

رہبر پرتاپ گڑھی ۔اتر پردیش

غزل

فکرِ اسلاف سے جو دل کو جِلا دیتا ہے
بالیقیں دشت کو گلزار بنا دیتا ہے

پالنے والا سوا رب کے کوئی اور نہیں
بطن مادر میں بھی وہ سب کو غذا دیتا ہے

اُس ریاکار کی قسمت میں تباہی ہے فقط
کر کے احسان جو دنیا کو جتا دیتا ہے

زندگانی سے وہ بیزار ہے اپنی لیکن
مجھ کو تادیر وہ جینے کی دعا دیتا ہے

جھوپڑی میں ہو کوئی یا کہ محل میں سچ ہے
سب کو اللہ بہ ہر حال غذا دیتا ہے

رُخ سے ظلمات کے پردے کو ہٹانے کے لیے
دل کو قرآں ہی بصیرت کی ضیا دیتا ہے

جب بھی ملتا ہوں میں رہبرؔ! سے خدا ہے شاہد
قلب میں وہ عجب احساس جگا دیتا ہے

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی۔استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

ظلم رہے اور امن بھی ہو؟
کیا ممکن ہے، تم ہی کہو؟

حبیب جالب کی یہ پکار آج بھی گونج رہی ہے، مگر اس بار یہ فریاد زمین کے کسی مظلوم شہری کی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی ہے، یہ سوال اسرائیل سے بھی ہے، امریکہ سے بھی، اقوامِ متحدہ سے بھی اور ان تمام خاموش تماشائیوں سے بھی، جو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک نسلی تطہیر Ethnic cleansing کا منظر دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی امن، مذاکرات اور انسانی حقوق کی مالا جپ رہے ہیں۔

رمضان المبارک کی مقدس گھڑیاں ہیں، دنیا بھر کے مسلمان عبادتوں میں مصروف ہیں، افطار کی روحانی ساعتیں ہیں، سحری کی نورانی برکتیں ہیں، تراویح اور عمرے ہیں، مگر غزہ کی سرزمین پر کچھ اور ہی منظر ہے، وہاں پھر سے بچوں کے جسموں کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں، ماؤں کی گودیں اجڑ رہی ہیں، گھروں کی چھتیں زمین بوس ہو رہی ہیں، بچے کھچے مکانات ملبے کا ڈھیر بن رہے ہیں، اور گلیاں خون میں رنگی جا رہی ہیں۔

اس درمیان اسرائیل کا جھوٹا پروپیگنڈا ہمیشہ کی طرح پوری ڈھٹائی سے دہرایا جا رہا ہے کہ یہ حماس کی بدعہدی کا نتیجہ ہے، اس نے یہ جواز گڑھ لیا ہے کہ جنگ دوبارہ اس لیے شروع کی گئی ہے کیونکہ حماس قیدیوں کے تبادلہ کے لیے تیار نہیں، اور دنیا کے نادان یا سازشی حلقے اس جھوٹ کو سچ مان کر بیچنے لگے،

مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسرائیل نے اپنے بیشتر یرغمالیوں کو جنگ بندی کے ذریعہ واپس حاصل کیا تھا، نہ کہ گولیوں سے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اسرائیلی وزیر جنگ یوآف گالانت نے خود کہا تھا کہ یہ معاہدہ مہینوں پہلے اور بہتر شرائط پر ممکن تھا، اگر نیتن یاہو کی ضد درمیان میں نہ آتی؟

پھر یہ سچ کیوں نہیں بولا جاتا کہ اسرائیل کا اصل مقصد اپنے یرغمالیوں کی واپسی نہیں، بلکہ فلسطینیوں کی نسل کشی تھی؟ اگر اسرائیل کا مسئلہ واقعی یرغمالی ہوتے، تو وہ جنگ بندی کا احترام کرتا، مذاکرات جاری رکھتا، اور معاہدے کے تحت طے شدہ امداد، عارضی مکانات، اور دوسرے مرحلہ کے مذاکرات کو آگے بڑھاتا، مگر ایسا نہیں ہوا، کیونکہ اسرائیل صرف اور صرف قتلِ عام چاہتا تھا۔

یہ تو سب پر واضح ہو چکا ہے کہ اسرائیل کو قیدیوں کا معاملہ صرف ایک بہانہ کے طور پر درکار تھا، اس نے پہلے مرحلہ کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے ہر ممکن چال چلی، اور جیسے ہی اس نے اپنے مطلوبہ یرغمالی واپس لے لیے، وہ جنگ بندی کو روند کر دوبارہ حملوں پر آمادہ ہو گیا، امریکہ، جسے انصاف کے ٹھیکیدار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس سازش میں پوری طرح شامل ہے۔

اگر کوئی اب بھی شک کرے کہ اسرائیل کا مقصد

فلسطینیوں کا خاتمہ ہے، تو اسے صرف ایک لمحہ کے لیے یہ سوال خود سے پوچھنا چاہیے: اگر حماس تمام اسرائیلی قیدیوں کو صرف جنگ بندی کے بدلہ چھوڑ دے، اور کسی فلسطینی قیدی کی رہائی کا مطالبہ بھی نہ کرے، تو کیا اسرائیل پھر بھی جنگ روکے گا؟ نہیں! اسرائیل کو جنگ چاہیے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی امن برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ امن اس کے ناپاک مقاصد کے خلاف جاتا ہے، اور قرآن اور بائبل میں یہودیوں کی جن گھناؤنی عادتوں عہد شکنی، افترا پردازی، مکاری اور جھوٹ کا ذکر کیا ہے، اس سے اس کی واضح طور پر تائید ہوتی ہے۔

یہ جنگ صرف موجودہ قتل و غارت کے لیے نہیں، بلکہ اس کے اثرات نسلوں تک محسوس کیے جائیں گے، اسرائیل کے مفکرین اور حکمت عملی تیار کرنے والے حضرات عرصہ سے ''الیوم التالی'' (اگلے دن) کے منصوبہ پر کام کر رہے ہیں، فلسطینی عوام کا مستقبل کیا ہوگا؟ اسرائیل چاہتا ہے کہ فلسطینیوں کے لیے کوئی مستقبل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حماس نے جب مصر کی اس تجویز کو قبول کرلیا، جس کے تحت غزہ کا انتظام ایک غیر حماسی امدادی کمیٹی کے سپرد کیا جاتا، تو اسرائیل نے فوراً اسے رد کر دیا، عرب ممالک نے غزہ کی تعمیر نو کے لیے منصوبہ پیش کیا، مگر اسرائیل، امریکہ اور ان کے کچھ عرب اتحادی اس کے خلاف کھڑے ہو گئے؛ کیونکہ یہ جنگ کبھی بھی حماس کو کمزور کرنے کے لیے نہیں تھی، بلکہ فلسطینی عوام کو مکمل ختم کرنے کے لیے تھی۔

اگر کوئی اب بھی اسرائیلی پالیسی کو ایک ''علاقائی تنازع'' سمجھتا ہے، تو وہ نادان ہے، اسرائیل کی توسیع پسندانہ جنگی پالیسی غزہ تک محدود نہیں، بلکہ یہ شام، لبنان اور پورے خطہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے، شام کی موجودہ حکومت نے کبھی اسرائیل سے جنگ نہیں کی، نہ ہی اس پر حملہ کیا، اور یہاں تک کہ بعض مواقع پر اسرائیلی جارحیت پر خاموش رہی، مگر اسرائیل پھر بھی وہاں حملے کرتا رہا۔

یہی حال مغربی کنارے کا ہے، جہاں اسرائیل ہزاروں فلسطینیوں کو گھروں سے بے دخل کر چکا ہے، مگر کوئی عالمی ردِ عمل نہیں، یہ وہی پالیسی ہے جسے اسرائیل ہمیشہ اپناتا ہے: پہلے زمین پر قبضہ کرنا، پھر قبضہ کو جواز دینا، اور آخر میں جنگ کے ذریعہ اسے مستقل حقیقت بنا دینا۔

یہ جنگ صرف اسرائیل کے توسیعی عزائم کی نہیں، بلکہ اسرائیلی داخلی سیاست کی بھی ہے، نیتن یاہو اپنے سیاسی کیریئر کو بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے، عدالتی مقدمات سے فرار، 7 اکتوبر کی ناکامی پر احتساب سے بچاؤ، دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کو راضی رکھنا — یہ سب کچھ وہ خون کے دریا بہا کر کر رہا ہے۔

اِیتمار بن غفیر کی پارٹی عظمۃ یہودیۃ (یہودی عظمت) کی حکومت میں واپسی کو محض اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ معاہدہ اسرائیل کے غزہ پر تازہ حملہ سے صرف پانچ دن پہلے طے پایا تھا، کیا یہ واقعہ واضح نہیں کرتا کہ یہ جنگ کسی دفاعی ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ داخلی سیاسی کھیل کے طور پر لڑی جا رہی ہے؟

لیکن اسرائیل کو اس درندگی سے باز کون رکھے گا؟ یہ وہ سوال ہے جو پوری دنیا کو درپیش ہے، خصوصاً عرب ممالک کے درپردہ اسرائیل نواز اور فلسطین دشمن سربراہوں کو، اسرائیل نے جب دیکھا کہ دنیا نے غزہ کے قتل عام پر کوئی کارروائی نہیں کی، تو وہ مغربی کنارہ میں بھی وہی کر رہا ہے، جب دنیا مغربی کنارہ میں نسل کشی پر خاموش رہی، تو اسرائیل نے شام، لبنان اور خطہ کے دیگر ممالک میں بھی اپنی مہم تیز کر دی، جب دنیا نے ہر ظلم کو برداشت کیا، تو اسرائیل کے ہاتھ کھل گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی اسے روکنے والا ہے؟ کیا فلسطینی بچوں کے خون کا کوئی حساب ہوگا؟ کیا کاغذی شیروں کی عرب دنیا، جو اپنے معاہدوں پر فخر کرتی ہے، اسرائیل کی جارحیت کو چیلنج کرے گی؟ کیا عالمی برادری فلسطین کی حمایت میں کھڑی ہوگی؟

یا پھر تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے گی، اور ہم سب خاموش رہیں گے، حتیٰ کہ جب فلسطینی قوم کا وجود مٹ جائے، اور پھر ہم ماتم کرتے پھریں کہ ہم نے کچھ نہ کیا؟

متعدد اسرائیلی مفکرین نے مختلف ادوار میں فلسطین کے حق میں آواز اٹھائی ہے، اور ان کے اقوال تاریخی اور اخلاقی تناظر میں اہم ہیں، ایک قابلِ ذکر نام مارٹن بوبر (Martin Buber) کا ہے، جو ایک ممتاز یہودی فلسفی اور مفکر تھے، لیکن انہوں نے فلسطین کے عرب باشندوں کے حقوق کی حمایت کی اور ایک مشترکہ ریاست کے تصور کو فروغ دیا، ان کا ایک مشہور اقتباس جو فلسطین کے حق میں ان کے موقف کو ظاہر کرتا ہے، 2 جون 1958 کو نیویارک میں Jewish Newsletter میں شائع ہوا تھا: ''جب ہم (نبوی یہودیت کے پیروکار) فلسطین واپس آئے، تو یہودی عوام کی اکثریت نے ہم سے سیکھنے کے بجائے ہٹلر سے سیکھنا پسند کیا''، یہ اقتباس ان کے اس خیال کی عکاسی کرتا ہے کہ انہوں نے اسرائیلی پالیسیوں میں تشدد اور جبر کے رجحانات کو تنقید کا نشانہ بنایا اور فلسطینیوں کے ساتھ پرامن بقائے باہم کی وکالت کی، بوبر کا ماننا تھا کہ یہودیوں اور عربوں کو فلسطین میں برابر کے حقوق کے ساتھ رہنا چاہیے، اور انہوں نے صہیونیت کے اس عسکری اور استعماری رخ کی مخالفت کی جو فلسطینیوں کے استحصال پر مبنی تھا۔

کاش اس موقف کو تائید حاصل ہوتی اور ہمارے اپنے ذاتی مفادات کے لیے ہم سے دغا نہ کرتے، ورنہ:

ظلم رہے اور امن بھی ہو؟
کیا ممکن ہے، تم ہی کہو؟

طٰہٰ صدیقی۔ پربھنی

غزل

ہو مخاطب تو بکھرتی ہے دہن کی خوشبو
اس کے لہجہ میں گھلی ہے جو سخن کی خوشبو

ہے تخیل کے دریچوں میں سراپا انکا
چار سو پھیلی ہے آہوئے ختن کی خوشبو

تھا عمل کونسا یہ راز خدا ہی جانے
مثل لوبان مہکتی ہے کفن کی خوشبو

لمس نے اُن کے معطّر جو کیا ہے ہم کو
گزرے جس راہ سے بکھری ہے بدن کی خوشبو

جانے کیا لوگ تھے کیسا تھا سفر وہ میرا
آج بھی ہوتی ہے محسوس تھکن کی خوشبو

ہم تو پردیس بھی لے آئے وہاں کی مٹی
''ہم کو پیاری ہے بہت خاکِ وطن کی خوشبو''

کاغذی پھول اُٹھا لائے ہو طٰہٰ کیونکر
ان میں بستی ہے کہاں روحِ چمن کی خوشبو

ذاکر اعظمی ندوی۔ریاض

بلریا گنج کے بانکے لال سے مدینہ منورہ کے پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی تک

اسلام کی صداقت کے معترف عصر حاضر میں اعظم گڈھ کے درنایاب کے ساتھ ایک خاص گفتگو

.اسلام کی صداقت جب افریقہ کے ایک کالے حبشی غلام بلال کے دل میں جانگزیں ہوجاتی ہے تو اسے عرب کے گوروں کا سیدنا بنا دیتی ہے، فارس کے آتش پرست سلمان پر جب مذہب اسلام کی خوبیاں عیاں ہوتی ہیں تو سلمان اہل بیت رسول کے خطاب سے سرفراز ہوتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اگر ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلامی مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا تو دوسری طرف حجۃ الوداع کے موقع پر ان زریں کلمات کے ذریعہ ''کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں، اور نہ ہی کوئی عجمی کسی عربی سے افضل ہے، نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے سوائے تقوی کے'' دنیائے انسانیت کو رنگ و نسل، ذات پات، بھید بھاؤ کے بتوں سے ہمیشہ کے لئے آزادی دلائی۔

ویسے تو آغوش اسلام میں پناہ لینے والے نومسلموں کے قصے بہت سننے میں آتے ہیں، اور ہر ایک جادہ حق کی جانب ہدایت کی مختلف داستانیں بیان کرتا ہے، مگر چند نفوس قدسیہ ایسے بھی ہیں جنہوں نہ صرف مذہب اسلام کو ذاتی طور پر کو اپنایا، اپنی زندگیوں میں نافذ کیا، بلکہ تاریخ اسلام میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے گئے جس پر ہم پشتینی مسلمان سوائے رشک کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔ The Road to Makkah کے مصنف بیسویں صدی میں اسلام کی بیش بہا خدمت کرنے والے یہودی النسل علامہ محمد اسد ہوں، یا یہودی ہی گھرانے کی امریکہ کی مریم جمیلہ جنہوں نے اسلامی تہذیب کی عظمت کو نوجوان نسلوں میں جاں گزیں کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی اور (Western Civilization Condemns Itself) کا علمی تحفہ دے کر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے مستشرقین کو ہمیشہ کے لئے خود اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کردیا، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک ایسی کڑی کے بارے میں آج ہم گفتگو کرنے جارہے ہیں جو بلریا گنج کے حکیم محمد ایوب ندوی (رح) کے حسن کردار سے متاثر ہوکر 16-17 سال کی عمر میں دولت اسلام سے سرفراز ہوتا ہے اور اس خطۂ اعظم کی مردم خیزی جس نے شبلی وفراہی، محدث کبیر حبیب الرحمٰن اعظمی، صاحب الرحیق المختوم صفی الرحمٰن مبارکپوری جیسے عباقرۂ زماں پیدا کئے پر مہر لگاتے ہوئے اور انہیں انفاس قدسیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام کی تاریخ میں وہ زریں کارنامہ انجام دیتا ہے جسے دنیا ہمیشہ یاد کرے گی۔ میری مراد پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی صاحب سے ہے۔

گذشتہ دسمبر کے اواخر میں ناچیز کا مدینہ کا سفر ہوا، جب سے ''دراسات فی الیہودیۃ والمسیحیۃ وادیان الھند'' کا مطالعہ کیا اور اپنے ام۔فل۔ کے تھیسس میں خوب استفادہ کیا تب سے دل میں شدید خواہش تھی کہ کیوں نہ مصنف کتاب سے ملاقات کی جائے۔ برادرم عمار اجمل اصلاحی سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ملاقات کا بندوبست کردیا جس کے لئے ہم تہ دل سے انکے شکر گذار ہیں۔ آیئے ہم پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی قبول اسلام کی داستان خود ان ہی کی زبانی سنتے ہیں۔

1959ء میری عمر کوئی پندرہ سولہ سال رہی ہوگی، ایک عزیز دوست ماسٹر جنید صاحب نے کہا کہ تم اس وقت گرمی کی چھٹیوں میں بلریا گنج آئے ہوئے (اس وقت میں شبلی کالج اعظم گڈھ میں زیر تعلیم تھا)، چلو حکیم ایوب صاحب سے ملاقات کراتے ہیں، یہ سوچ کر ہمت نہیں ہوئی کہ حکیم صاحب مریضوں میں مشغول ہوں گے، ہم کیوں انکو تکلیف دیں اور وہ ہمیں کیوں ملاقات کا وقت دیں گے، لیکن جنید صاحب کے اصرار نے ہمیں مطب تک پہونچادیا۔

یوں تو انہیں پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج دیکھنے میں کچھ اور ہی لگ رہا تھا، صورت وسیرت دونوں میں یکتائے روزگار چہرے پر نورانی بارش اور دل میں شفقت وکرم کا جوش، نظر پڑتے ہی ساری گھبراہٹ دور ہوگئی، جنید صاحب نے میرا تعارف کرایا اور عرض کیا کہ ان کو ہندی میں اسلام سے متعلق کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دے دیں، یہ گرمی کی تعطیل میں کچھ دنوں بلریا گنج میں رہیں گے۔

انسان کے شب وروز گذرتے رہتے ہیں لیکن اس کو کیا معلوم رحمت الٰہی کا دروازہ کب کھلے گا، اس پہلی ملاقات کا اثر آج بھی دل پر تازہ ہے، جس کو امانت سمجھ کر اسکی حفاظت کررہا ہوں۔ بقول شاعر:

پہلی نظر بھی آپ کی اف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

گفتگو کی حلاوت اور لہجے کی لطافت آج تک دل میں رچی بسی ہے۔

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوى
فصادف قلباً خالياً فتمكنا

(محبت اس وقت آئی جب میں اسے جانتا بھی نہ تھا، دیکھا کہ دل بلکل خالی ہے، بس دل میں بس گئی)۔

محترم حکیم صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب ''ستیہ دھرم'' کیا دی کی آسمان وزمین کے خزانے بھی ہیچ لگنے لگے۔

﴿فمن يرد الله أن يهديه يشرح صدره للاسلام﴾

کتابوں کے مطالعے سے مجھے فطری رغبت تھی، چنانچہ بڑے شوق سے کتاب پڑھی اور اس مطالعے نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اب تک مہیب تاریکیوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ تہ در تہ تاریکیاں چھٹ رہی ہیں اور پہلی بار روشنی کی کرنیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس احساس نے میرے دل میں اس روشنی سے ہمکنار ہونے کی تڑپ پیدا کردی۔ میں نے اس کتاب کو کئی بار پڑھا اور ہر بار گرمی شوق دوآتشہ ہوتی گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس مصنف کی ہندی میں ترجمہ شدہ تمام کتابیں حاصل کر کے پڑھوں گا۔

میں نے ہندو مذہب کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی، البتہ ایک ہندو گھرانے میں پیدایش اور اپنے گردوپیش کے شدید مذہبی ماحول کی وجہ سے میں ہندو مذہب کے عقائد

اور رسوم سے اچھی طرح متعارف بھی تھا اور بے حد متاثر بھی، بلکہ میرے دل میں ہندو مذہب کے لیے شدید عصبیت تھی۔ میں ہندو مذہب کے سوا کسی دوسرے مذہب کو برسرِ حق نہیں سمجھتا تھا، لیکن اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور میرے سامنے اسلام کا یہ دعویٰ آیا کہ ”ان الدین عند اللہ الاسلام“ یعنی صرف اسلام ہی دینِ حق ہے تو میں نے ایک بار پھر ہندو مذہب کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اپنے کالج کے سنسکرت کے لیکچرار کی طرف رجوع کیا۔ وہ گیتا اور ویدوں کے بہت بڑے عالم تھے، لیکن مجھے مطمئن نہ کرسکے۔ امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ ہندو مذہب کے دیومالائی نظام عقائد اور ناقابلِ فہم رسوم میں اطمینانِ قلب کے لیے سرے سے کوئی سامان ہی موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے نوجوان طبقے میں اپنے مذہب کے دیومالائی تصورات اور عجیب وغریب رسوم کے متعلق سخت بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ اگر ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کی ذہنی سطح اور مخصوص پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے لٹریچر تیار کر کے ان میں پھیلایا جائے تو ان میں دعوتِ اسلامی کے پھیلنے کے بڑے مواقع ہیں۔ اس کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے۔

اسی دوران مجھے خواجہ حسن نظامی کا ہندی ترجمہ قرآن پڑھنے کا موقع ملا۔ اللہ نے مزید مہربانی یہ کی کہ شبلی کالج ہی کے ایک استاد نے جو سید مودودیؒ کی فکر سے گہرے متاثر تھے اور جنھوں نے ایک ہفتہ وار حلقہ درس قرآن بھی قائم کر رکھا تھا، اسلام کے لیے میرا ذوق وشوق دیکھ کر مجھے اپنے حلقہ درس میں شامل ہونے کی خصوصی اجازت دے دی۔

سید مودودیؒ کی کتابوں کے مسلسل مطالعے اور حلقہ درس قرآن میں باقاعدگی سے شمولیت نے میرے قبول اسلام کے جذبے کو دو آتشہ کر دیا، مگر بعض خدشات دل و دماغ میں ابھر ابھر کر میرے اس روحانی سفر کی راہ میں حائل ہو جاتے اور میں ٹھٹھک کر رہ جاتا۔ سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ میں دوسرے اہل خاندان کے ساتھ کس طرح نباہ کر سکوں گا، خصوصاً چھوٹی بہنوں کے مستقبل کے متعلق بہت پریشان تھا، مگر اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر فوراً اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ان ہی استاد صاحب نے جن کے حلقہ درس میں میں بلا ناغہ شامل ہوتا تھا، سورۂ عنکبوت کا درس دیا۔ پہلے انھوں نے یہ آیت پڑھی:

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ. (العنکبوت ۲۹:۴۱)

”جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے، جو گھر بناتی ہے اور سب سے بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ کاش لوگ (اس حقیقت سے) باخبر ہوتے۔“

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے تمام سہارے مکڑی کے جالے کی طرح کمزور اور بے بنیاد ہیں۔ ان کی اس تشریح اور دل میں کھب جانے والے اندازِ بیان نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں نے بغیر کسی تاخیر کے اسلام قبول کرنے اور تمام سہاروں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا سہارا پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی مجلس میں میں نے اپنے استاد سے کہا کہ میں فوری طور پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی ان سے نماز سے متعلق کوئی مناسب کتاب بھی مانگی۔ انھوں نے مجھے ادارہ ”الحسنات“ رام پور (یوپی)

کی آسان ہندی زبان میں شائع کردہ کتاب ''نماز کیسے پڑھیں؟'' دی، جس سے میں نے چند گھنٹوں کے اندر اندر نماز سیکھ لی۔ مغرب کے قریب دوبارہ استاد کے پاس پہنچا۔ ان کے ہاتھ پر باقاعدہ اسلام قبول کرلیا اور ان ہی کی اقتدا میں نماز مغرب کی نماز ادا کی۔ یہ میری سب سے پہلی نماز تھی اور اس کی کیفیت میں کبھی بھول نہ سکوں گا۔

قبول اسلام، انکشاف اور اعلان کے درمیان کئی ماہ کا وقفہ رہا۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے فوراً بعد مجھے ایک زبردست ذہنی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ دراصل اس عملی کشمکش کا نقطۂ آغاز تھا، جو چند ماہ بعد میرے قبول اسلام کے انکشاف اور اعلان کے بعد شروع ہونے والی تھی۔ اس ذہنی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا سلسلہ تعلیم منقطع ہوکر رہ گیا۔ میرا سارا وقت یا تو سید مودودیؒ کی کتابوں کے مطالعے میں گزرتا یا ان کتابوں کے منتخب حصے اپنے ساتھی طلبہ کو سنانے میں۔ نماز کے وقت میں چپ چاپ گھر سے نکل جاتا اور کسی الگ تھلگ جگہ جا کر نماز ادا کرتا۔ یہ سلسلہ کوئی چار ماہ تک جاری رہا، لیکن میری یہ سرگرمیاں زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ میں اعظم گڑھ میں اپنے ایک عزیز کے ہاں رہتا تھا۔ اس کا لڑکا میرا دوست اور ہم راز تھا۔ اس نے جو مجھ میں یہ تبدیلیاں دیکھیں تو پہلے خود مجھے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس طرح اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنے والدین اور عزیز و اقارب سے کٹ جاؤں گا، لیکن جب اس نے ''ناقابل اصلاح'' پایا تو والد صاحب کو کولکاتہ خط لکھ دیا کہ فوراً اعظم گڑھ پہنچیں، ورنہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ والد صاحب خط ملتے ہی پہنچ گئے اور پھر مجھے بتدریج ان حالات سے دوچار ہونا پڑا، جن کی توقع تھی اور جن کے لیے میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر پہلے سے تیار کر چکا تھا۔

والد صاحب کولکتہ سے اعظم گڑھ پہنچے تو انھوں نے ابتدا میں براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے میرے حالات کا جائزہ لیا، پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ میں شاید کسی جن یا بھوت سے متاثر ہو گیا ہوں، مختلف پنڈتوں اور پروہتوں سے میرا علاج کرانے لگے، لیکن کوئی جن یا بھوت ہوتا تو شاید جھاڑ پھونک سے چلا جاتا۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا، چنانچہ جو چیز بھی پنڈتوں اور پروہتوں سے لاکر دیتے، میں بسم اللہ پڑھ کر کھا لیتا، بہرحال جب وہاں میرا علاج نہ ہوسکا تو والد صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کولکاتہ لے جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ تحریک اسلامی کے افراد سے جو ان کے نزدیک اس ''بیماری'' کی اصل جڑ تھے، رابطہ برقرار نہ رہ سکے۔ لیکن بھلا یہ رابطہ کہاں اس طرح کے حیلوں بہانوں سے ٹوٹ سکتا تھا؟ چنانچہ کولکاتہ پہنچتے ہی میں نے وہاں کے تحریکی رفقا سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح میرا سب سے بڑا یعنی نماز پڑھنے کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ والد صاحب کو علم ہوا تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ انھوں نے فوراً مجھے الہ آباد میں مقیم اپنے ایک عزیز کے ہاں بھیج دیا۔ یہاں اب جھاڑ پھونک کے ساتھ ساتھ مختلف پنڈتوں اور پروہتوں نے مجھے سمجھانا، بجھانا شروع کیا۔ کہنے لگے: ہندو مذہب اسلام کے مقابلے میں زیادہ مکمل مذہب ہے۔ لیکن جب میں نے ہندو مذہب کے بارے میں سوالات کیے تو وہ جواب نہ دے سکے۔ زچ ہو کر بولے: اچھا، اگر ہندو مذہب چھوڑنا ہی ہے تو پھر مسلمان بننے کے بجائے عیسائی بن جاؤ، کیونکہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کے مقابلے میں عیسائیوں کی فارغ البالی سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عیسائیت اسلام کے مقابلے میں

کہیں زیادہ بہتر مذہب ہے۔ میں نے جواب میں کہا: دراصل میں مسلمانوں سے نہیں، بلکہ اسلام سے متاثر ہوکر مسلمان ہوا ہوں۔

آخر کچھ عرصے کی جھاڑ پھونک اور بحث مباحثے کے بعد مجھے ناقابل علاج قرار دے دیا گیا اور والد صاحب دوبارہ گھر لے آئے۔ گھر والوں کا پہلے ہی رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ مجھے مکان کے ایک کمرے میں رکھا گیا اور تحریکی رفقا سے رابطہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ساتھ ہی والدہ صاحبہ، بہنوں اور دوسری رشتے دار خواتین نے مجھے اسلام سے باز رکھنے کے لیے اپنے طور پر رونے دھونے اور منت سماجت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر جھاڑ پھونک بھی جاری رہا، لیکن یہاں ہر چیز بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر گھر والوں نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے ان سب نے بھوک ہڑتال کر دی۔ میرے لیے یہ بڑا ہی سخت اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ والدین اور بھائی بہن کوئی بھی کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔ وہ میری نظروں کے سامنے بھوک سے نڈھال پڑے سسکتے رہتے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے استقامت بخشی اور اسلام سے باز رکھنے کا یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا۔

دین حق سے مجھے برگشتہ کرنے کے جب سارے حربے ناکام ثابت ہوئے تو تشدد کے وہ راستے اپنائے گئے جس کا صدر اسلام کے عظیم سپوتوں بلال وسمیہ وعمار کو گذرنا پڑا، مگر اسلام کا جادو تھا کہ سر چڑھ کر بولتا تھا اور اترنے کا نام نہیں لیتا تھا، جب سارے کوششیں ناکام ہوگئیں اور کوئی بھی تدبیر کامیاب نہ ہو پائے تو بفضل رب والدین کے رویے میں بھی خاصی تبدیلی آ گئی، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر انھیں مجھ جیسے حالات سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو بعید نہ تھا کہ معمولی توجہ سے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔

تحریک کے ذمہ داروں نے میری تعلیم کا بندوبست دار السلام عمر آباد میں کرایا۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا، جو بآسانی مل گیا۔ چار سال کے بعد وہاں سے فارغ التحصیل ہوا تو جامعۃ الملک عبدالعزیز، مکہ مکرمہ میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ ایم اے میں میرا تحقیقی مقالہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ احادیث کی نوعیت اور حیثیت سے متعلق تھا اور اس کا عنوان تھا ''ابو ہریرۃ فی ضوء مرویاتہ وفی جمال شواہدہ وانفرادہ'' یہ امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ سے منسلک ہو گیا، رابطہ میں رہتے ہوئے بھی میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ میں نے اپنے تھیس (Thesis) میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے عدالتی پہلو پر تحقیق کی ہے اور اس کا عنوان ہے: "اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ یہ دونوں تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں (مصنف کی اجازت سے ناچیز انشاء اللہ موخر الذکر کتاب کا انگریزی میں ترجمہ جلد مکمل کرے گا)۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بھیانک اندھیروں سے نکل کر روشنی میں اور اتھاہ گہرائیوں سے اٹھ کر بلندیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے اپنے مقصد زندگی کا پہلی بار صحیح شعور حاصل ہوا۔ میں نے یہ بات بھی بڑی شدت سے محسوس کی کہ اسلام اور موجودہ مسلمان معاشرے میں بہت بڑا فرق ہے اور غالباً یہی بات غیر مسلموں کے

قبول اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یوں تو اسلامی نظام حیات کے ہر پہلو کی کیفیت کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست کی سی ہے، لیکن پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اسلام کے رشتہ اخوت ومؤاسات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اسلام کے ان تابناک اصولوں کی برکت سے مسلمان معاشرے میں ”انما المومنون اخوۃ“ (الحجرات ۴۹:۱۰) کا جذبہ جاری وساری ہے، اسی طرح آج بھی مسلمان معاشرے میں معاشرتی مساوات کی جوروح کار فرما ہے، اس کی نظیر کسی اور معاشرے میں نہیں ملتی۔

”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“ (الحجرات ۴۹:۱۳) کے جس ارشاد ربانی نے دور رسالت مآب میں عربی نخوت کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا اور بلال حبشی اور سلمان فارسی کو ابو بکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا ہم پلہ بنا دیا تھا، اس کے اثرات اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمان معاشرے پر بڑے صاف اور واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

تحریک اسلامی میں مجھے سب سے زیادہ تحریک کے داعی سید مودودیؒ کے ذاتی کردار نے متاثر کیا۔ راہ حق میں عزیمت واستقامت کی جو نظیر سید مودودیؒ نے قائم کی، اس کی مثال ماضی قریب میں بمشکل ہی ملے گی۔ محض دعویٰ کرنا اور بات ہے، لیکن پھانسی کی سزا ملنے پر بھی پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دینا اور باطل کے ساتھ سمجھوتے کی پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔

کسے پتا تھا کہ بلریا گنج کی تنگ گلیوں میں رہنے والا بانکے لال ایک دن عالم اسلام کی مایہ ناز دانشگاہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا نہ صرف استاذ بلکہ اسکے تحقیقی ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہوکر ریٹائر ہوگا، اور اس سے بڑی باشندگان اعظم گڈھ کی نیک نامی اور کیا ہوگی کہ اسی مٹی کے ایک لعل کے لئے مسجد نبوی میں درس حدیث کی خاص مسند سجائی جاتی ہے۔

اب تک اردو، ہندی، عربی میں اعظمی صاحب کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ”گنگا سے زمزم تک“ اردو زبان میں ہے جوان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی داستان ہے۔ ہندی زبان میں اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کو ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی صورت میں خالص علمی انداز میں پیش کیا ہے، ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت کا تقابلی مطالعہ جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہے، موصوف کی تالیف کردہ مختلف کتابیں سعودی عرب کی جامعات کے اعلی درجوں کے کورس کا حصہ ہیں جس میں سرفہرست ”دراسات فی الیہودیہ والمسیحیہ وادیان الہند“ قابل ذکر ہے۔

اس کے علاوہ ”الجامع الکامل“ کی متعدد جلدوں میں میں کتب احادیث میں منتشر احادیث صحیحہ کو یکجا کر وہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے جسکا اعتراف 2-3 صدیوں بعد علمی حلقوں کو ہوگا۔ ”المنۃ الکبریٰ“ و ”المدخل إلی السنن الکبری للبیہقی“ و ”تحفۃ المتقین“ پروفیسر اعظمی کی وہ گرانقدر علمی تصنیفات ہیں جن کا ایک زمانہ شرمندہ احسان رہے گا۔

☆☆☆

مفتی عبید اللہ شمیم قاسمی۔استاذحدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا

ایک عظیم محدث

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ (عرف: ابوالمآثر)

محدث جلیل ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا شماران نابغہ روز گار شخصیات میں سے ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کو اپنے لیے اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، اور بیسویں صدی کے افق پر ایک محدث جلیل بن کر ابھرے، انہوں نے حدیث کی کتابوں کی تحقیق کے سلسلے میں ایسا لازوال کارنامہ انجام دیا ہے جس سے ہمیشہ ان کا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

محدث اعظمی نہ صرف علوم دینیہ حدیث وتفسیر، فقہ، عقائد، احسان وتصوف کے بحر ذخار تھے بلکہ علوم آلیہ صرف ونحو، ادب وبلاغت، سیر وتاریخ، منطق وفلسفہ اور علم الاسرار میں بھی نابغہ روزگار تھے، اور زہد وورع، قناعت واستغنا،صبر واستقلال میں سلف صالحین کی یادگار تھے، فطری ذہانت وذکاوت، اخاذ طبیعت، دقیقہ شناسی، نکتہ رسی، سرعت فہم اور غیر معمولی قوت حافظہ نے آپ کے وجود کو مجسمہ علم اور ذہن کو ایک کتب خانہ بنادیا تھا، کتابیں ہی آپ کی جلیس ورفیق اور زندگی کا ساتھی تھیں۔لیکن تمام علوم میں مہارت تامہ کے باوجود آپ کو خاص شغف علم حدیث سے تھا اور یوں وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے مستحق بنے، جس میں حدیث کا شغف رکھنے والوں کے لیے سرسبز وشادابی کی دعا کی گئی ہے،نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاها وحفظها وبلغها (سنن الترمذی، رقم الحدیث:۲۶۵۸)

محدث اعظمی سے پہلے ہندوستانی علماء میں مخطوطات کی تحقیق کا رواج بہت ہی شاذ ونادر ملتا ہے، آپ نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ کئی ایسی کتابوں کو منصۂ شہود پر لادیا جو صدیوں گذرنے پر بھی لوگوں کی دسترس سے کوسوں دور تھیں، اس مضمون میں ان کی حیات کے روشن کارناموں پر ایک روشنی ڈالنے کی ایک ادنی کوشش کی گئی ہے۔

ولادت تعلیم وتربیت:

آپ کی ولادت ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء کو اعظم گڑھ کے مشہور مردم خیز قصبہ مؤ ناتھ بھنجن میں ہوئی، اس وقت مؤ ضلع نہیں تھا، بلکہ ۱۹۸۹ء میں مئو وجود میں آیا، چنانچہ آپ اپنے نام کے ساتھ اعظمی اسی بنا پر یا امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کی وجہ سے لکھتے تھے، آپ کے والد کا نام مولوی محمد صابر تھا جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے اور نہایت عابدوزاہد اور خوش اوقات انسان تھے، کثرت تلاوت اور سلام میں پہل کرنے میں اپنی مثال آپ تھے،تقریبا ۳۶؍ سال تک محلے کی مسجد میں لوجہ اللہ بچوں کو قرآن پاک اور دینیات پڑھاتے رہے،علم دین کے اس سعادت خیز ماحول میں آپ کی نشونما ہوئی، جس کا اثر آپ کی پوری زندگی میں نمایاں رہا،قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں آپ نے

اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں اس کے بعد عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی بڑی کتابیں آپ نے مولانا عبدالرحمٰن مؤی سے پڑھیں، صرف ونحو کی اکثر کتابیں ضلع کے مشہور اور بافیض عالم مولانا ابوالحسن مؤی سے پڑھیں، اسی طرح اصول فقہ اور حدیث میں مشکاۃ المصابیح اور ترمذی جلد اول آپ نے استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی تلمیذ رشید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے پڑھی، مولانا اعظمی کی نشو نما اور علمی ساخت پرداخت میں علی الترتیب آپ کے ولی صفت والد محترم مولوی محمد صابر صاحب اور یگانہ عصر استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب رحمہما اللہ مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اول الذکر پاک نفس بزرگ نے آپ کے مزاج میں دین کی عظمت ومحبت اور حمیت وصلابت پیدا کی، بچپن کا یہ دینی انصباغ زندگی بھر آپ کی ذات میں نمایاں رہا، اور ثانی الذکر علمی مربی نے آپ کے اندر تحصیل علم کی ایسی چاہت ومحبت بھر دی کہ آپ کی شخصیت زندگی برائے علم کا نمونہ کامل بن گئی۔

علم وفن کی تحصیل وتکمیل کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۷ء میں آپ دار العلوم دیوبند پہنچے اور داخلہ امتحان میں اعلی نمبرات سے کامیابی حاصل کی، لیکن درمیان سال میں بیماری کی وجہ سے آپ کو وطن واپس آنا پڑا، اور آئندہ سال پھر دار العلوم دیوبند کا قصد کیا اور دورہ حدیث میں داخل ہو کر محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے ترمذی جلد اول، علامہ شبیر احمد عثمانی سے مسلم، حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی سے ابوداود اور دیگر اساتذہ دار العلوم سے بقیہ کتب صحاح ستہ کا درس شروع کیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اس سال بھی ربیع الاول میں پھر بیمار ہوگئے، چنانچہ مئو واپس آکر حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی صاحب سے صحاح ستہ کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد دار العلوم مئو ہی میں درجہ علیا کے استاذ مقرر ہوئے، اور دو سال تک درس دیتے رہے، اس کے بعد مظہر العلوم بنارس میں بحیثیت صدر مدرس آپ کو بلایا گیا اور کئی سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے مگر پھر آپ نے اپنے استاذ مولانا ابوالحسن مئوی کی دعوت پر مفتاح العلوم کو زینت بخشی اور پھر اس مدرسے کی شہرت کو چار چاند لگا دیا اور اس کو ایک مشہور مدرسہ بنا دیا ۱۳۴۷ھ سے لیکر ۱۳۶۹ھ تک آپ نے اس مدرسے میں صدر مدرس مہتمم اور شیخ الحدیث تمام عہدوں پر فائز رہتے ہوئے شاگردوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کی؛ تعلیم وتدریس کا یہ زریں سلسلہ مفتاح العلوم میں مزید آگے نہ بڑھ سکا، کیونکہ آپ نے ۱۳۶۹ھ میں اپنے تصنیفی وتحقیقی کاموں بالخصوص مصنف عبد الرزاق کی تصحیح وتعلیق میں مصروفیت کی بنا پر خدمت سے سبکدوش ہوگئے، مگر ۱۳۹۲ھ میں جب آپ کے دیرینہ رفیق اور معتمد خاص مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی شیخ الحدیث ومہتمم مفتاح العلوم کا انتقال ہوگیا تو ارباب حل وعقد نے آپ سے دوبارہ مفتاح العلوم میں چلنے کی درخواست کی جس کی بنا پر آپ نے دوبارہ اس مدرسے کی خدمت کو قبول کرلیا اور مسند صدارت کو زینت بخشی اور ۱۹۸۰ء میں المعہد العالی اور مرقاۃ العلوم کے قیام تک اس مدرسے میں خدمت انجام دی۔

حضرت محدث اعظمی کی خدمات:

حضرت محدث اعظمی کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اللہ رب العزت نے آپ کو تصنیف وتالیف کا صاف ستھرا ذوق عطا فرمایا تھا، جس سے آپ زندگی بھر کام لیتے رہے، اور بیسویں صدی میں آپ نے علم حدیث کی ترویج

واشاعت میں جو مہتم بالشان اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں بلاشبہ وہ آپ کا تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے، جس میں آپ کا کوئی سہیم ونظیر نہیں ہے، مولانا اعظمی نے جب کتابوں کو اپنی تحقیق وتعلیق سے شائع کیا اور ان پر عالمانہ وفاضلانہ مقدمہ تحریر کیے، جن میں مصنف کے حالات وکمالات اور ان موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ اور اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مخطوطات کی نشاندہی وغیرہ کو بیان کیا ہے، اسی طرح مختلف نسخوں کے مابین مقارنہ اور ان کے فروق کو بیان کیا ہے، ظاہر ہے یہ ایسے امور ہیں جنہیں وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کی متون وشرح حدیث پر گہری نظر ہو، علم روایت کے تمام انواع اور علم درایت کے تمام مقاصد وادراک سے کامل واقفیت رکھتا ہو اور طبقات رواۃ اور طرق حدیث کی تحقیق میں اسے مہارت تامہ ہو، ذیل میں ان نادر کتابوں میں سے چند ایک پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں جنہیں محدث اعظمی نے اپنی تحقیق وتعلیق اور مفید حواشی سے آراستہ کر کے شائع کرایا جس سے اس فن میں آپ کی عبقریت اور مجتہدانہ مہارت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

(۱): مسند الحمیدی، امام بخاری کے استاذ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی المتوفی ۲۱۹ھ کی تالیف ہے جو اب تک غیر مطبوعہ تھی جسے آپ نے اپنی تحقیق وتعلیق سے ۱۳۸۲ھ میں پہلی بار حیدرآباد سے شائع کیا۔

(۲): کتاب الزہد والرقاق، یہ حضرت عبد اللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ کی تالیف ہے، اب تک مخطوطہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب علماء سے دسترس سے دور تھی، اور بہت سے اہل علم کو اس کے بارے میں معلومات بھی نہیں تھی، علامہ سید سلیمان ندوی جیسے کثیر المطالعہ اور محقق عالم نے بھی اس کتاب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے، چنانچہ وہ معارف ۱۹۴۴ء میں تحریر فرماتے ہیں: ''قدماء میں ایک بزرگ عبداللہ بن المبارک متوفی ۱۸۱ھ کا نام ہمیں معلوم ہے، جنہوں نے کتاب الزہد والرقاق کے نام سے مستقل تالیف فرمائی ہے مگر یہ ہیچمدان اب تک اس کی زیارت سے محروم رہا ہے اس لیے اس کی نسبت سے کچھ عرض نہیں کر سکتا''، مگر محدث اعظمی کی غواصی کی داد دیجئے کہ علوم حدیث کے بحر بیکراں سے اس موتی کو برآمد کر لیا اور اپنی تحقیق وتعلیق سے آراستہ کر کے اہل علم کے سامنے پیش کیا، یہ کتاب ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں سے ۱۳۸۵ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔

(۳): سنن سعید بن منصور: ابوعثمان سعید بن منصور متوفی ۲۲۹ھ کی تالیف ہے، اسے اپنی تحقیق سے ۱۴۰۳ھ میں ۲؍جلدوں میں شائع کیا۔

(۴): المطالب العالیہ بزائد المسانید الثمانیہ جو حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ کی تالیف ہے جسے آپ نے اپنی تحقیق وتعلیق سے آراستہ کر کے ۴؍جلدوں ۱۳۹۰ھ میں وزارۃ الاوقاف کویت سے شائع کیا۔

(۵): مصنف لعبد الرزاق بن الہمام الصنعانی متوفی ۱۲۱ھ، کی تالیف ہے، یہ کتاب احادیث وآثار کا ایک دائرۃ المعارف ہے، ۱۱؍جلدوں میں ۱۳۹۰ھ میں دارالقلم بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

(۶): کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للہیثمی ۴؍جلدوں میں ۱۳۹۹ھ میں مؤسسۃ الرسالۃ بیروت سے شائع ہوئی۔

(۷): مصنف ابن ابی شیبہ جسے شیخ محمد عوامہ نے اپنی تحقیق وتعلیق سے ۲۶؍جلدوں میں شائع کیا ہے اس کی زمین مولانا اعظمی نے ہی تیار کی تھی اور اس کی ابتدائی ۳؍جلدیں

مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی تھیں۔

اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی کتابوں کو اپنی تحقیق وتعلیق سے شائع کیا، اورآپ کی تصانیف اس کے علاوہ ہیں، جس میں حدیث، رجال حدیث، فقہ اور دیگر موضوعات پر آپ نے اپنی نادر تحقیقات سے عالم کو روشناس کرایا، ذیل میں اس کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

(۸): الحاوی لرجال الطحاوی جس میں امام طحاوی کی کتاب معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں کے رجال پر بحث کی گئی ہے، ایک طرح سے یہ ایک عمل مبتکر اور نیا کام ہے، اب تک کسی نے بھی امام طحاوی کے مشکل الآثار کے رجال سے بحث نہیں کی تھی مگر آپ نے اس کام کو بھی اس وقت انجام دیا جس وقت آپ کی عمر صرف ۳۰ر سال تھی جس کے مسودہ کو دیکھ کر علامہ انورشاہ کشمیری نے آپ کے کثرت معلومات کی تعریف فرمائی تھی۔

(۹): الاتحاف السنیۃ بذکر محدثی الحنفیۃ اس کتاب کے نام سے ہی واضح ہے کہ اس میں حضرات محدثین حنفیہ کا ذکر کیا ہے۔

نصرۃ الحدیث:

اردو زبان میں یہ رسالہ ہے جس میں منکرین حدیث کی تردید کی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ حکیم الامت حضرت تھانوی کے سامنے جب یہ رسالہ پیش کیا گیا تو اسے دیکھ کر فرمایا کہ اس جیسا رسالہ اگر میں بھی لکھنا چاہوں تو نہیں لکھ سکتا، رکعات تراویح پر بھی محدث اعظمی کا ایک محقق رسالہ ہے جس میں حضرات صحابہ کے دور سے لیکر اس دور تک تراویح کے سلسلے میں مدلل بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ بھی آپ کی بہت سے تصنیفات ہیں۔

علم فقہ میں مقام ومرتبہ:

بالعموم سبھی اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت مولانا اعظمی ایک بلند پایہ محدث اور علوم حدیث کے زبردست ناقد ومحقق تھے، مگر یہ کم ہی لوگ جانتے ہیں آپ ایک فقید المثال فقیہ بھی تھے، آپ کی شان محدثیت دیگر کمالات علمیہ پر اس طرح چھا گئی تھی کہ آپ کی فقہی بصیرت ومہارت پس منظر سے اوجھل ہوگئی، چنانچہ جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمیؒ دارالعلوم مئو کے شیخ الحدیث تھے اور فتاوی کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے تو اگر کوئی فقہ کا بہت مشکل سوال ہوتا تو مولانا اعظمی سے رجوع کرتے، اور کبھی کبھی مولانا اعظمی کو جوابات دکھانے کے بعد ارسال کرتے، نیز آپ کی فقاہت کی اس سے بڑی سند اور کیا ہوگی کہ برصغیر کے سب سے بڑے فقہی مرکز دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے لیے آپ کے پاس کئی مرتبہ خطوط آئے، اور وہ بھی شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کی طرف سے کہ آپ اس خدمت کو قبول فرمالیں مگر آپ نے اپنی علمی مشغولیت کی بنا پر اس سے معذرت کردی۔

۱۹۸۶ء میں جب جمعیۃ علماء ہند نے امارت شرعیہ کے قیام کے لیے ملک کے چودہ صوبوں سے تین ہزار نامور مفتیان کرام اور علماء عظام، پروفیسر اور ممبران پارلیمنٹ وغیرہ کا ایک عظیم الشان اجتماع ۲ر اکتوبر کو بلایا تو اس موقع پر آپ کو بالاتفاق امیر الہند چنا گیا، جس عہدہ پر تاحیات آپ باقی رہے۔

احسان وسلوک:

سلوک وتصوف میں بھی محدث اعظمی بلند مقام پر فائز

تھے، علم کا غلبہ اور اخفائے حال کی بے پناہ کوشش کی بنا پر آپ کی احسانی کیفیت کا عام طور پر لوگوں کو ادراک نہیں ہوسکا، لیکن جو لوگ آپ کی مجلس کے حاضر باش تھے وہ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ سنت کے عامل اور شریعت پر عمل کے سلسلے میں بہت ہی متصلب تھے چنانچہ مولانا انظر کمال صاحب مئوی جو کہ محدث اعظمی کی خدمت میں کئی برس رہے، انہوں نے اس سلسلے میں کئی واقعات بندہ سے بیان کئے جسے اختصار کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں، آپ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے، اپنی بیعت کا تذکرہ آپ نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے جسے مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب نے تذکرہ مصلح الامت میں درج کیا ہے: ''وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی مرتبہ اس وقت ہوئی جب میں دار العلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا، ۱۳۴۷ھ غالبا ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی کی وجہ سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہوگیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری اور خواجہ مجذوب الحسن صاحب خانقاہ میں موجود تھے، مولانا فتح پوری حضرت تھانوی کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ کے سامنے ذرا ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے، مولانا فتحپوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی قیام گاہ پر آنے جانے اور بات کرنے کا موقع ملا، جس شب میں بعد مغرب میں شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا، اس کے بعد والے دن میں غالبا عصر کے بعد مولانا فتحپوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہیے، ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کرتے یہ ان کی خصوصیت ہے'' (مقدمہ تذکرہ مصلح الامت ۶،۷)۔ اجازت وخلافت آپ کو حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ اجل مصلح الامت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری کے علاوہ حضرت مولانا منیر الدین صاحب مہاجر مکہ (خلیفہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے) بواسطہ حاجی عبد الحمید صاحب اورنگ آبادی بھی ملی تھی، اس کے علاوہ آپ کو حضرت تھانوی کی مجلس میں حاضری کے بعض اصول سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا، مگر اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے ارادت مندوں کے اصرار کے باوجود آپ لوگوں کو بیعت نہیں کرتے تھے، البتہ کچھ مخصوص عقیدت مند آپ سے متوسل ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے، اس موقع پر اس بات کا تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا کہ آپ حضرت تھانوی کے دست گرفتہ ہونے کے باوجود ملکی سیاست میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے نظریہ کے مؤید وحامی تھے، اسی وجہ سے تاحیات جمعیت علماء ہند سے وابستہ رہے، یہ آپ کے اعتدال ووسطیت کا کمال ہے کہ دونوں اکابر کا اعتماد آپ کو ہمیشہ حاصل رہا۔

تلامذہ:

مولانا اعظمی نے کم وبیش تیس چالیس سال تک مختلف زمانے میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس عرصہ میں کتنے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، البتہ چند مشاہیر تلامذہ کا تذکرہ ہم بطور نمونہ کر رہے ہیں: (۱) مولانا منظور احمد نعمانیؒ (۲) مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ (۳) مولانا محمد حسین بہاریؒ سابق استاذ دار العلوم دیوبند (۴) مولانا عبد الستار صاحب معروفیؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء (۵) مولانا عبد الجبار اعظمی سابق شیخ

الحدیث مظہر العلوم بنارس (۶) مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ سابق مفتی دار العلوم دیوبند (۷) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۸) صاحبزادہ محترم مولانا رشید احمد اعظمی مدظلہ، اس کے علاوہ بھی بہت سے تلامذہ ملک وبیرون ملک خدمات انجام دے رہے ہیں، اور بہت سے انتقال کر گئے، عرب تلامذہ اور شاگردوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے، جن میں الشیخ عبد الحلیم محمود سابق شیخ الازہر مصر، شیخ عبد الفتاح ابوغدۃ، شیخ حسن مشاط، شیخ علوی مالکی، علامہ خیر الدین الزرکلی، شیخ محمد عوامہ اور دکتور بشاد عواد معروف وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

محدث اعظمی کی سوانح اور ان کے علوم ومعارف اور علمی کمالات وخدمات کو بیان کرنے کے لیے بہت وقت اور صفحات درکار ہیں، اس مضمون میں اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے، بلا شبہ وہ بیسویں صدی میں ہندوستان کے ایک نامور محدث تھے، اور آپ نے خصوصاً کتب حدیث کے مخطوطات جواب تک اہل علم کی نظروں سے اوجھل تھے ان کو حاصل کرکے، اور ان کو اپنی نادر تحقیقات سے مزین کرکے منظر عام پر لاکر امت پر ایک عظیم احسان فرمایا، وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ جدید ٹیکنالوجی دریافت نہیں ہوئی تھی، اس وقت کس طرح آپ نے اس کام کو انجام دیا اور کتنی تکلیفیں برداشت کی ہوں گی اس کے بارے میں وہی لوگ واقف ہوں گے جو اس میدان کے راہی ہیں، اللہ رب العرت سے دعا ہے کہ آپ کے علوم سے ہمیں فیض یاب ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
غنچۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

انجنی کمار گوئل۔حیدرآباد

غزل

اصلیت سے وہ شناسائی کرانے آئے
دن بُرے آئے تو پھر ہوش ٹھکانے آئے

دل میں اک ٹیس اُٹھی منہ کو کلیجہ آیا
یاد جب بھی ہمیں وہ گزرے زمانے آئے

خواب کا دیکھنا بھی لگتا ہے اب خواب مجھے
جب بھی آئے وہ مری نیند اُڑانے آئے

مصلحت اس میں ہے کچھ کوئی تو ہے بات ضرور
خود پہل کرکے جو وہ ہاتھ ملانے آئے

اک ترے آنے سے بدلا ہے یہ دستور چمن
پھر خزاؤں میں بہاروں کے زمانے آئے

ہم جلاتے ہیں اندھیروں کو مٹانے کے لئے
وہ چراغوں ہی سے گھر میرا جلانے آئے

خود ہی کانٹا بنے وہ راہ کا میری گوئلؔ
راستے سے جو مرے کانٹے ہٹانے آئے

عبدالغفار صدیقی

بھول کو بزرگوں کی بھول ہی کہا جائے

اسلاف کے کارناموں پر تنقید کی جاسکتی ہے مگر کیچڑ نہیں اچھالی جاسکتی

چند دن قبل میرے ایک عزیز اپنے بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے آئے۔ان کی تعلیم بہت معمولی ہے۔کرانے کی دوکان کرتے ہیں۔گاؤں میں رہتے ہیں۔مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث ہیں۔کارڈ دینے کے بعد انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ”تم بھی معاویہ کو رضی اللہ عنہ کہتے ہو؟“ میں نے جواب دیا: ”جی ہاں، وہ صحابی ہیں اس لیے ان کو رضی اللہ عنہ کہنا ہی چاہیے۔“ یہ سن کر وہ بولے: ”تم نے ان کے کرتوت نہیں دیکھے۔“ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی اور کہا کہ بھائی صاحب آپ شادی کا کارڈ دینے آئے ہیں۔ اس پر بات کیجیے اور چائے پیجیے، یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔مگر انھوں نے کہا کہ شادی کارڈ تو میں دے چکا۔اس جملے کا مطلب یہی تھا کہ ان کی بات کا جواب دیا جائے۔ مجھے ان کی یہ بات بہت ناگوار گذری۔میں نے ان سے کہا کہ تم کون ہوتے ہو ان کے کرتوت دیکھنے والے؟ تمھیں اس عمل کا کتنا اجر ملے گا؟ تمہاری ضرورت کیا ہے کہ ان کے کرتوت سے آگاہی حاصل کرو۔تم مدرس نہیں ہو کہ طلبہ کو بتانے کی ضرورت ہو،تم محقق نہیں ہو کہ تمھیں کہیں مقالہ پیش کرنا ہو،تم واعظ و مصلح قوم نہیں ہو کہ قوم کو آگاہ کرو۔تم کرانے کی دوکان کرتے ہو۔آخر اس سوال کی ضرورت ہی کیا ہے۔اس کے بعد میں نے کہا کہ تم اہل حدیث ہو۔مگر تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی جس میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے مردوں کی خوبیاں بیان کرنے اور ان کی برائیاں بیان نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔(" اذکروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویھم." ترمذی) اس پر بھی انھوں نے اعتراض کر دیا کہ چاہے وہ برا آدمی ہو۔میں نے عرض کیا کہ ہاں، خواہ کتنا ہی برا آدمی ہو۔پھر میں ان کو دوسری حدیث سنائی جس میں پیارے نبی ﷺ نے فرمایا: جو اپنے مسلمان بھائی کے عیوب چھپائے گا اللہ حشر کے دن اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔(ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة۔ترمذی)

مذکورہ واقعہ کوئی نیا نہیں ہے۔ہم صدیوں سے یہی کام کرتے آرہے ہیں۔گڑے مردے اکھاڑنا ہماری عادت ہے، ہمارے نزدیک سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ اپنے اسلاف کی کردار کشی کریں۔ہمارے ذخیرہ کتب میں ہزاروں کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں۔ہم نے مرحومین کی عبارتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا۔ ہم نے ان کی تحریروں کو پس منظر سے ہٹ کر دیکھا اور دکھایا۔ اپنے بزرگوں کو معصوم اور دوسروں کے بزرگوں کو خطا کار قرار دیا۔اسی بنا پر ہمارے درمیان فرقے وجود میں آ گئے۔اپنے مصنفین کی تحریروں پر آنکھ بند کر یقین کیا، کبھی تحقیق کی

ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔اس ضمن میں ہمارا حال اس شخص کا سا ہے جو اپنے گھر کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔لوگ اس سے پوچھتے ، کیوں رو رہے ہو؟ وہاں بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔جب اس سے اصرار کیا گیا کہ رونے کی وجہ بتائے۔تو اس نے کہا کہ فلاں حضرت فرما گئے ہیں کہ تیری بیوی بیوہ ہوگئی ہے۔ بتاؤ حضرت کی بات پر روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ لوگوں نے کہا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ تم تو زندہ ،تمہاری بیوی بیوہ کیسے ہوسکتی ہے؟ اس نے کہا کہ حضرت کی بات کیسے جھوٹی ہوسکتی ہے۔بقول شاعر

شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے

محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا؟

ہم اپنے اسلاف کی بابت اکثر ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں جن کا کوئی تعلق ہماری موجودہ زندگی میں کامیابی یا ناکامی سے نہیں ہے نہ ان کا تعلق ہمارے ایمان کی کمی وبیشی سے ہے۔مثال کے طور پر حضرت امیر معاویہؓ کے کسی فیصلے یا کسی عمل سے ہماری موجودہ زندگی کا کیا تعلق ہے؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو کتنی حدیثیں یاد تھیں،اس سے ہمیں کیا لینا دینا؟ (بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں) امام غزالیؒ یا امام ابن تیمیہؒ کے نظریات کا ہماری کامیابی یا ناکامی میں کیا دخل؟ عبدالوہاب نجدیؒ یا سید مودودیؒ کے افکار وعمل سے ہمارے دین و ایمان سے کیا نسبت؟ اگر ہم ان کو خدانخواستہ غلط سمجھتے ہیں تو ان سے دور رہیں،ان پر ایمان لانے کا ہمیں کسی نے حکم نہیں دیا ہے ۔ہمارے دین اور آخرت کا دارومدار قرآن وسنت پر ہے، اگر قرآن وسنت کے نام پر کوئی بات ہمارے سامنے آئے تو ہمیں اس بات کا پورا حق ہے کہ ہم تحقیق کرلیں کہ یہ بات ان دونوں سرچشموں میں موجود ہے یا نہیں ،اگر جواب اثبات میں ملے تو سر اطاعت خم کردیں ،اگر معلوم ہوجائے کہ شیخ محترم کی بات ان دونوں ہدایت ناموں سے ماخوذ نہیں تو آگے بڑھ جائیں۔

مسلمان ہونے کے لیے جن امور پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے،وہ واضح ہیں،حلال وحرام بھی مفصل طور پر قرآن و حدیث میں بیان کردیے گئے ہیں۔اخلاقیات و معاملات اور نظام عدل کی تفصیلات و جزئیات بیان کردی گئی ہیں ،آخرت میں اللہ تعالیٰ جن امور کی بابت سوال فرمائیں گے وہ بھی بتادیے گئے ہیں۔جنت میں لے جانے والے اعمال اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال کی فہرست بھی اللہ و رسول نے بنا کر ہمیں دے دی ہے۔پھر ہماری ایسی کون سی ضرورت ہے کہ اپنے ان بزرگوں کے متعلق توہین آمیز کلمات کہیں،جن کے کارناموں کو ہم اچھی طرح جانتے نہیں ،اور جاننے کا کوئی مستند ذریعہ بھی ہمارے پاس نہیں۔

قرآن مجید میں ہدایت کی گئی کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہیں تم ان بتوں کے متعلق بدزبانی نہ کرو۔یعنی کافروں کے معبودوں کو بھی برا نہ کہو۔اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ تم ان کے سامنے جھک جاؤ یا ان کا احترام کرنے لگو۔ اس کی وجہ بھی بتادی گئی کہ تم انھیں برا کہوگے تو وہ تمہارے معبود کو برا کہیں گے۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ-كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ-ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام:108) اور اُنہیں برا بھلا نہ کہو جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ زیادتی کرتے ہوئے جہالت کی وجہ

سے اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے یونہی ہم نے ہر اُمت کی نگاہ میں اس کے عمل کو آراستہ کردیا پھر انہیں اپنے رب کی طرف پھرنا ہے تو وہ انہیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔

یہ ہدایت بھی ایک سے زائد بار کردی گئی کہ تم جن امور میں اختلاف کرتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ کردے گا کیوں کہ بالآخر تمہیں اسی کے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ میدان محشر میں ، حساب کتاب کے دن سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ اللہ جب حساب لینے کے لیے کافی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کسی مرحوم کا حساب لینے والے۔

جو لوگ زندہ ہیں۔ ان کی حد تک ہمارا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم ان سے ملاقات کرکے یا باوثوق ذرائع سے معلومات حاصل کرکے اپنی رائے قائم کریں ، اگر وہ خطا پر ہیں تو ان سے دور رہیں۔ اس لیے کہ زندہ انسانوں کے اچھے برے عمل کا ہم پر اثر پڑسکتا ہے ، جو لوگ مر کھپ گئے ، جن کی قبریں بھی معدوم ہو گئیں ، جو ہمارے نہ عزیز ہیں نہ رشتہ دار ، جن کا ہم سے نہ استاذی کا رشتہ ہے نہ شاگردی کا ، ان کی بھول اور غلطیوں کا بکھان کرنے سے ہماری نیکیوں کے دفتر میں کوئی اضافہ نہیں ہونے والا۔

آپ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو ایک بھی واقعہ نہیں ملے گا ، جس میں آپ نے ابوجہل یا ابولہب کے لیے توہین آمیز الفاظ زبان مبارک سے نکالے ہوں۔ جب کہ یہ دونوں آپؐ کے اور آپؐ کے دین کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ آپ صحابہ کرام کی سیرت کی ورق گردانی کیجیے اور مجھے ایک بھی ایسا واقعہ بتادیجئے جس میں انھوں نے اپنے سے اختلاف کرنے والے کو مغلظات سے نوازا ہو۔ اختلاف رائے کا اظہار بھی آپ کو ملے گا ، جنگ صفین میں وہ ایک دوسرے کے مقابل بھی نظر آئیں گے مگر باہمی احترام و اکرام کا نور ان کی پیشانیوں سے ٹپکتا ہوا ، آپ محسوس کریں گے۔ یہی حال تابعین و تبع تابعین میں بھی آپ دیکھیں گے۔ کسی فقیہ نے اپنی کسی کتاب میں بھی دوسرے فقہاء کے لیے کوئی نازیبا لفظ استعمال نہیں کیا۔ شاگردوں نے بعض امور میں اپنے استاذ سے اختلاف کیا لیکن دلائل اور احترام کے ساتھ۔ کہتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے کسی نے مولانا احمد رضا خاںؒ کا ذکر بغیر مولانا کے کردیا تو وہ ناراض ہو گئے ، اور تنبیہ فرمائی کہ ان کا نام احترام سے لو۔

تنقید اور تنقیص کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔ تنقید یہ ہے کہ ہم کسی کے علمی کارناموں ، یا اس کے منصبی اعمال اور فیصلوں کا اس طرح جائزہ لیں کہ جو اچھائیاں ہیں وہ بھی منظر عام پر آجائیں اور جو کوتاہیاں اور لغزشیں ہیں وہ بھی معلوم ہو جائیں۔ جب کہ تنقیص نام ہے خواہ مخواہ عیب نکالنے کا ، اچھائی میں برائی تلاش کرنے کا۔ پھر تنقید کام ہے ان محققین کا جن کا مطالعہ وسیع ہو ، جن کا عمل خدا ترسی پر مبنی ہو ، جن کی تحقیق برائے اصلاح ہو ، جن کے ذمہ امت کی رہنمائی کا فریضہ ہو۔ ایک عام دوکاندار یا کم علم آدمی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی بھی بزرگ یا علمی شخصیت پر کیچڑ اچھالے کجا کہ حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں گستاخی کرے۔ ایسا کرکے وہ اپنے نامہ اعمال میں گناہ تو درج کراسکتا ہے کوئی نیکی اسے نہیں مل سکتی۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر فرد سے الگ الگ حساب لیا جائے گا۔ اس سے کسی ایسے شخص کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا جو اس کی ذمہ داری میں نہ ہو۔ ایک باپ سے اس کی نابالغ اولاد کی بابت سوال ہوگا ، ایک حاکم سے

خزاں لُوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

امیرؔ اب سخن کی بڑی قدر ہو گی
پھلے پھولیں گے نکتہ داں کیسے کیسے

اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔کل راع مسئول کا یہی مطلب ہے۔کسی حدیث کے مطابق بھی اپنے سے بڑے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔اولاد سے باپ کے بارے میں ،شاگردوں سے استاذ کے بارے میں اور رعایا سے حاکم کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے ۔بھول چوک بشریت کا تقاضا ہے۔نبی اور غیر نبی میں فرق و امتیاز ہی یہ ہے کہ غیر نبی سے خطا کا امکان ہے۔وہ لوگ جو اہم مناصب پر فائز ہوں ،جن کے ذمہ امور مملکت ہوں ،جنھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں احکامات صادر کیے ہوں ،سیکڑوں فیصلے کیے ہوں ،اس کا امکان ہے کہ ان سے کوئی بھول ہوگئی ہو۔مگر اس بھول کا حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔ہم بھارتی مسلمان آج جن مسائل سے دوچار ہیں اور ہمارے سر پر ہندتوا کا جو طوفان منڈرا رہا ہے،اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے حال کو اس طرح سنواریں کہ ہمارا مستقبل روشن اور تابناک ہوجائے۔

عافیت اسی میں ہے حد میں ہی رہا جائے
بھول کو بزرگوں کی بھول ہی کہا جائے

☆☆☆

امیرؔ مینائی

غزل

آپ نے یہ شعر اکثر سُنا یا پڑھا ہوگا،خصوصاً اس کا مصرعۂ ثانی تو لازماً پڑھ رکھا ہوگا۔

ہوئے نام وَر بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ہوئے نام وَر بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چُن چُن کے مارے
نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے

نہ گُل ہیں نہ غنچے نو بُوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

یہاں درد سے ہاتھ سینے پہ رکھا
وہاں ان کو گزرے گُماں کیسے کیسے

ہزاروں برس کی ہے بُڑھیا یہ دنیا
مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے

ترے جاں نثاروں کے تیور وہی ہیں
گلے پر ہیں خنجر رواں کیسے کیسے

جوانی کا صدقہ ذرا آنکھ اٹھاؤ
تڑپتے ہیں دیکھو جواں کیسے کیسے

سعید بن محمد نقشؔ:

ایک مایہ ناز مصور اور منفرد فکر کا شاعر

سعید بن محمد حیدرآباد (آندھراپردیش) کے وہ نامور مصور ہیں جن کی بنائی گئی پینٹنگس آندھراپردیش للت کلا اکیڈیمی حیدرآباد، اسٹیٹ میوزیم حیدرآباد کے علاوہ للت کلا اکیڈیمی نئی دہلی نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ دہلی، اور پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی کی پرشکوہ دیواروں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ پینکس، فرانس، لندن، کینیڈا، مصر، نیویارک اور پاکستان میں بھی محفوظ ہیں۔

اسی طرح بیرونی ممالک میں مختلف آرٹ اسوسی ایشن (Different Art Association) کی جانب سے منعقد کردہ نمائشوں جیسے افغانستان، مصر، روس، اور امریکہ میں نمائندگی کا انھیں اعزاز بھی حاصل رہا۔

سعید بن محمد بابدر (نقشؔ) ضلع محبوب نگر میں 7، ستمبر 1921ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ قرآن اور متقی و پرہیزگار تھے جنھیں سب لوگ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور بہت ہی ادب وہ احترام کرتے تھے ان کا نام محمد بن سعید بابدر تھا۔ ان کے آباواجداد اٹھارویں صدی عیسوی میں یمن سے ہجرت کرکے یہاں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان کا شجرہ یمن کے علاقہ حضرموت کے عرب قبیلے ''الدینی'' سے ملتا ہے۔

سعید بن محمد کی ابتدائی تعلیم روایتی انداز سے دارالشفاء ہائی اسکول حیدرآباد میں ہوئی اور یہیں پر وہ اپنے استاد (ڈرائنگ ماسٹر) مسٹر گنگادھرراؤ پاٹھک سے ڈرائنگ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ڈرائنگ ماسٹر نے اس نوعمر شاگرد میں پنہاں صلاحیتوں کو محسوس کیا اور انھوں نے 1938ء میں مدراس سے ڈرائنگ کے لوئیر اور ہائیر امتحانات میں شرکت کی ترغیب دی۔ چونکہ مصوری ان کی خداداد صلاحیت تھی۔ جس کی وجہ سے زمانہ طالب علمی سے ہی مصوری کے مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔ جس سے ان کی خوداعتمادی میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔ بعد ازاں اسی اسکول میں چند ماہ تک بحیثیت ڈرائنگ ماسٹر کی خدمات بھی انجام دیں۔

1941ء میں حیدرآباد میں نئے قائم شدہ سنٹرل اسکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس میں داخلہ لیا۔ (یہ اسکول اب کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکٹیکچر کے نام سے موسوم ہے) اور جواہرلال نہرو ٹکنالوجیکل یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ یہاں پر ابھی آرٹ کی تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ ان کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ کی بڑی تعریف کی جانے لگی۔ آپ کی یہ پہلی تصویر فروخت ہوئی جسے نواب سالار جنگ بہادر نے حاصل کیا۔ آخرکار 1945ء میں جناب خاں بہادر سید احمد صاحب اور مسٹر سوکمار دیوسکر کے زیر تربیت مصوری کا ڈپلوما اعزاز کے ساتھ حاصل کیا اور اسی سال یعنی 1945ء میں انھیں چھتاری طلائی تمغہ (گولڈ میڈل) حاصل ہوا۔

سعید بن محمد کا نام انیسویں صدی کے پانچویں دہے کے ہندوستان کی ترقی پسند تحریک سے منسوب رہا۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک میں ایک تخلیقی انداز سے اپنا حق ادا کیا۔ جب کہ ان کے کئی احباب ادب کی مختلف اصناف جیسے شاعری، افسانہ نگاری، ناول نویسی یا ترقی پسند رجحانات کے اخبارات و رسائل

کے مدیران کی حیثیت سے ماقبل آزادئی ہند نئے ہندوستان کی تشکیل میں مصروف تھے۔

سعید بن محمد واٹر کلر اور آئیل پینٹنگس کو اپنے احساس بیداری، شعور اور وابستگی کو تخلیقی ترقی پسند تحریک کے قائدین اور ممتاز شاعروں سے جذباتی تعلق رہا جو کہ ان کے معنی خیز فن کا ایک فطری تقاضہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ علمی مشغولیت کے با وجود انھیں اپنے اطراف کے ماحول سے والہانہ محبت رہی۔وہ اپنے وقت کی سب سے زیادہ فیصلہ کن تحریک سے متعارف ہوئے جو کہ اس دنیا کو اپنے نظریہ کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے محنت کشوں نے شروع کی تھی۔ان کا ابتدائی دور اس جدوجہد میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ان کی شمولیت سے عبارت ہے اور ان کی پورٹریٹ کشی سے دلچسپی اس وابستگی کا ایک پہلو بھی ہے۔انہوں نے پورٹریٹ پینٹنگ کا انتخاب فرمایا اور اس میں انہوں نے جلد ہی مہارت حاصل کرلی۔تھوڑے ہی دنوں میں واٹر کلر پورٹریٹس کے لئے کافی مقبول ہو گئے اور پوٹریٹس میں ان کی حقیقت پسندی کا ہر ایک معترف ہو گیا اور ان کے پورٹریٹس کی بہت ہی تعریف وتوصیف ہونے لگی۔سعید بن محمد نے ابتداء آرٹ کے ایک ٹیچر اور آزادی کے بعد ایک ممتاز آرٹسٹ کی حیثیت سے فن کاروں کی بھی تخلیق کی اور بلاشبہ وہ اپنے فن کے استاد کی حیثیت سے نئی افقوں کی تلاش کرنے والے ایک شہکار کی حیثیت سے اپنے موضوع کے لئے عام مردوں، عورتوں اور محنت کش طبقہ کا انتخاب فرمایا اور جاگیر دارانہ اور صاحب ثروت طبقات پر محنت کشوں کو ترجیح دی۔اس طرح انہوں نے مروجہ نظام حیات کے خلاف اپنے ردعمل کا تخلیقی اظہار کیا۔انھوں نے قومی زندگی کی جدوجہد عوام کی رنگارنگ زندگی اور دیہاتوں سے اپنے فن کا مواد حاصل کیا۔ان کی پینٹنگس 1945ء three animals 1951 student at work ان کے اظہار اسلوب کی اور فارم کے طاقتور اظہار کا نمونہ پیش کرتی ہیں اور فن کار کے زاویہ نگاہ اور جذبہ انسانیت کو پیش کرتی ہیں۔

سعید صاحب کے اندر ایک سچا تخلیقی فن کار جیتا اور سانس لیتا رہا۔ان کی رگوں میں روانی کے ساتھ فن کے گراں قدر نمونے رنگوں، خطوط اور اشکال کی صورت میں دوڑتے پھرتے رہے۔انسانی خلوص اور اس کی سرگزشت ومحبت کی یہی کلیت ہے جو ان کے پورے وجود کو قوت اظہار کے طوفان سے معمور کر دیتا ہے۔اسی خصوصیت کی قومی سطح پر اعتراف کی حامل ان کی وہ گراں قدر تخلیق آندھرا کے قدیم وتاریخی ستواہنہ دور کے نیم اساطری ماحول کو اس کی پوری شان وشوکت، جاہ وحشمت، تخت وتاج، فوج، ہاتھی اور فصیلوں کے ذریعہ اس دور کی عظمت وجلال کو انھوں نے اپنی اس پینٹنگ ''گوتمی پتراشری شاتا کرنی'' دوم 1959ء کو وسیع کینوس (''72 x ''48 tempora) پر پوری توانائی کے ساتھ پیش کیا۔اس عظیم الشان پینٹنگ کی تکمیل میں پورے پانچ سال کا عرصہ لگا۔اس تصویر کے تخیل اور وجدان کے حصول کے لئے انہوں نے ناسک، امراوتی اور سانچی جیسے تاریخی مقامات کا دورہ کیا۔

1952ء سے ہندوستان کے ایک اور مایہ ناز سپوت و مصور جناب ایم ایف حسین سے ان کا گہرا تعلق اور ربط ضبط رہا۔جناب ایم ایف حسین فارم''form'' کے تعلق ان کی کامیابیوں اور ان کی گہری انسان دوستی سے بلاشبہ بے حد متاثر رہے اور سعید بن محمد کے انتقال کے بعد انہوں نے کہا کہ'' سعید'' آج بھی ان کی پینٹنگس کے ساتھ زندہ جاوید ہیں۔''

1953ء میں سعید صاحب کو دیوسکر طلائی تمغہ دیا گیا۔ان کی پینٹنگس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں 1941ء سے 1954ء کے عرصہ کے دوران دو طلائی تمغے اور آرٹ کی مختلف کل ہند نمائشوں میں 9 نقروی تمغے اور 3 پیتل (براس) کے تمغے حاصل کئے۔

1955ء کے آس پاس انہوں نے ابری تکنیک 'abri technique'' کا انتخاب کیا۔اس تکنیک کے ذریعہ کاغذ پر

مرمریں نقوش کا اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے فارم کو متحرک بنانے اور رنگوں کو تابنا کی بخشنے کے لئے اس تکنیک کو اپنایا۔ اپنے اس نئے انتخاب کے بارے میں خود سعید صاحب کہتے ہیں کہ:

''روایتی تیکنیک کی تمام کوتاہیوں سے واقف ہونے کے بعد میں نے پانی کی سطح پر آئیل کلر کو بکھیر دیا اور سطح آب پر انہیں آزاد تیرنے کا موقع دیا۔ بعد ازاں میں نے رنگوں سے امیج ترتیب دینے شروع کیے جو پانی کا شفاف سطح پر تیرتے ہیں۔ اور جب وہ میری خواہش کے مطابق شکل اختیار کر لیتے ہیں تب میں انھیں کاغذ یا کینوس پر منتقل کر لیتا ہوں۔''

اس ابری تکنیک پر تبصرہ کرتے ہوئے آرٹ کے مشہور پروفیسر این ایس بیندر کہتے ہیں

''سعید بن محمد جو تیکنک استعمال کر رہے ہیں وہ آرٹ کی دنیا میں بالکل نادر و نایاب اور اچھوتی ہے۔ ہمارے ملک کو چاہیئے کہ وہ اس تکنیک سے بیرونی دنیا کو روشناس کرائے ورنہ کسی طرح یہ تکنیک ہمارے ملک سے باہر چلی جائے گی اور دوبارہ ایک بیرونی چیز کی طرح یہاں واپس آئے گی۔''

اس تکنیک کے اختیار کرنے کے بعد سعید صاحب نے کئی اکسپریشن expression'' کمپوزیشن'' composition'' اور پورٹریٹ portrait بنائے۔ اس تکنیک کے ذریعہ تاش کے پتوں کے موضوع پر بنائی گئی تصویریں 1971 secquence اور 1966 Rummy میں ٹکسچر texture کی ایک خاص ندرت ہے۔ ان تصاویر میں روایتی انداز میں تاش کے پتے کھیلتے ہوئے انسانوں کی بجائے خود تاش کے پتوں کو بادشاہ، رانی اور غلام کی حیثیت سے خود ہی انسانی شکل میں ابھرتے اور پیش ہوتے ہیں جو قابل دید ہیں۔

سعید بن محمد کے سگنیچر اسکیچس (دستخطی خاکے) بھی پور ٹریٹ کی دنیا میں ایک دلچسپ اضافہ رہا۔ کسی بھی شخص کی دستخط سے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ انسانی شکل ابھارتے اور اس میں نہ صرف علاماتی معنی پیدا کرتے ہیں بلکہ اس پورٹریٹ کو ایک زیبائش ترتیب بھی دیتے ہیں۔ اس قسم کے اسکیچس (خاکوں) میں ایم ایف حسین، پکاسو، اندرا دیوی دھنراج، کرشن چندر، سلیمان اریب، اور مخدوم محی الدین پر مبنی خاکے وغیرہ وغیرہ بہت ہی دلچسپ اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

1957ء میں بنائی گئی ان کی دو مایہ ناز پینٹنگس بھی بہت ہی مقبول ہوئیں۔ جن میں ایک 1857ء کے مجاہدین آزادی کی ایک یادگار جو حیدرآباد کی سابق ریزیڈینسی Residency کے باب الداخلہ کے سامنے تراشی گئی۔ دوسری ناگر جنا ساگر بند کی تعمیر سے پہلے اس کی خیالی تصویر۔

1966ء میں حیدرآباد کی آرٹ سوسائٹی نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر ''تمر اپترا'' عطا کیا۔

1969ء میں کلکتہ کی اکیڈیمی آف آرٹس کی ترتیب دی ہوئی نمائش میں سب سے اچھی تصویر کا انعام ملا۔ 1945ء سے 1974ء تک انہوں نے طلائی تمغہ، نقروئی اور پیتل کے تمغوں کے علاوہ دس انعام اول، بیس نقد انعام اور کئی میرٹ سرٹیفکٹ مختلف نمائشوں میں حاصل کئے۔

حیدرآباد میں پانچ اور دہلی میں پانچ TABLEAUX خود ڈیزائن کر کے بنائے۔

1975ء میں حکومت آندھراپردیش نے عالمی تلگو کانفرنس کے موقع پر سعید صاحب کو نقد انعام اور اعزاز عطا کیا۔

1976ء میں انہوں نے شہر حیدرآباد کی مکرم جاہی روڈ پر واقع ہاؤزنگ بورڈ کی عمارت پر'' 14 x 300 بڑا میورل و نارٹکس میڈیم بنایا۔

سعید صاحب نہ صرف پینٹنگ کے ذریعہ اپنی بات کہتے رہے بلکہ وہ ایک اچھے شاعر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ انسانی جذبات کا اظہار اپنی نظموں کے ذریعہ کرتے اور الفاظ کا استعمال اسی

جذبے سے کرتے ہیں۔ جس جذبے کے تحت وہ آپ پر آزادانہ تیرتے ہوئے رنگوں کو اپنے برش Brush کے ذریعہ کاغذ یا کینوس پر پیش کرتے رہے۔ ان کی خاص نظمیں جن میں رنگوں کا ذکر ہے بہت زیادہ مطلق Abstract اور علاماتی نظر آتے ہیں۔

سعید بن محمد نقش کا شعری مجموعہ ''رنگ و آہنگ'' ان کے انتقال کے ڈھائی سال بعد ان کی زوجہ کی دلچسپی سے بہت ہی شاندار پیمانہ پر 10 رجولائی 1984ء کو شائع ہوا۔ اس مجموعہ کلام پر ملک کے نامور مصور، ادیب، صحافی و شاعر حضرات جو کہ اصل میں سعید صاحب کے دوست احباب میں شامل تھے۔ اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے قرطاس ابیض پر اپنے دلی جذبات کا ان کی شخصیت، مصوری اور شاعری پر کھل کر اظہار خیال فرمایا ہے۔

جناب اختر حسین ''حرف آغاز'' رنگ و آہنگ'' شعری مجموعہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ

''سعید بن محمد نقش کا مجموعہ کلام'' رنگ و آہنگ'' پیش خدمت ہے اس میں آپ کو اردو شاعری کا ایک نیا رنگ ملے گا۔ نیا آہنگ ملے گا بصری اور نطقی فن کے امتزاج کا الگ نیا روپ دکھائی دے گا۔ ایسے انوکھے شعری پیکر نظر آئیں گے کہ آپ ان سے جمالیاتی مسرت بھی حاصل کرسکیں گے اور وجدانی بصیرت بھی''۔

پروفیسر عالم خوندمیری ''سعید بن محمد نقش مصور شاعر'' عنوان سے بہت ہی تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''دراصل سعید اپنی بعض نظموں میں خاص کر جن میں رنگوں کا ذکر ہے بہت زیادہ مطلق (ABSTRACT) اور علاماتی نظر آتے ہیں ان کی بعض نظمیں رنگوں اور الفاظ کے حسین امتزاج کی بہترین مثال ہیں جن میں الفاظ کے اشکال میں بدلنے اور اشکال کے لفظی جامہ پہننے کی کشمکش محسوس کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر ''نئی آواز کا شاعر'' عنوان سے مضمون میں لکھتے ہیں:

''سعید بن محمد نے اپنی شاعری میں تمام فنون لطیفہ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ فنون لطیفہ کی اصل ایک ہے۔ احساس جمالی، احساس کمالی مختلف ہیئتوں میں اپنے آپ کو متشکل کرتا ہے نغمہ، رقص، تعمیر، موسیقی اور شاعری اس کے مختلف اظہارات ہیں۔ اردو کے کم شاعروں کے یہاں تمام فنون لطیفہ سے واقفیت اور ان کے ذوق کا احساس ملے گا''۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''سعید بن محمد نقش کی شاعری'' سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''سعید بن محمد نقش کیا کیا کچھ تھا۔ بہترین دوست تھا، مصور تھا، حسن اور نغمہ پر جان دیتا تھا شاعر تھا۔ دوستی سے لے کر شاعری تک وہ ہر صورت میں فنکار تھا''

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ آگے لکھتے ہیں:

'سعید اپنے دوستوں کا عاشق تھا۔ مخدوم، میر حسن، سلمان اریب راگ و رنگ کی محفلوں میں اس کے ہم نشین رہے ہیں۔ ان کی موت اس کے لئے صدمہ جان کاہ ثابت ہوتی ہے مخدوم پر جو نظم کہی اس کا صرف یہ شعر ہی دیکھئے جس میں مخدوم کی ساری شخصیت کو سمیٹ لیا ہے۔

شعر

دیار غیر میں تفسیر زندگانی تھا
ہمارے دیس کی مخدوم اک نشانی تھا

میر حسن کے بارے میں کہتا ہے۔

''بساط رقص'' کی محفل سے اٹھ گئے افسوس
ہماری بزم کے خوشبو تھے زندگانی تھے

''بساط رقص'' میں میر حسن اور مخدوم کی بے پناہ دوستی اور محفل رنگ رقص کی ساری یادیں اکھٹا ہوگئی ہیں۔

سلمان اریب کے سانحہ ارتحال پر اچھی نظم کہی ہے لیکن آخری شعر میں اپنے آپ کو سلمان اریب سے جس طرح وابستہ اور پیوستہ کردیا اس کا جواب نہیں۔

مرے جنم کا وہ دن تھا،اور اس کا یوم وفات
غمِ اریب مرے ساتھ جیسے میری حیات

غرض سعید بن محمد نقش ایک ہمہ جہت فنکار تھا مصور تھا،پیکر تراش تھا اور پیکر شناس بھی۔اس نے خود اپنے متعلق کہا ہے۔

دکن کا نقش ہوں،آذر بھی ہوں مصور بھی
سخنوروں کے لئے ہوں میں ایک شاعر بھی

بہر حال اس شعری مجموعہ ''رنگ وآہنگ'' میں جملہ (49) بہت ہی اثر انگیز نظمیں اور (13) روایتی انداز میں غزلیں ہیں جو قاری کو یقیناً اس کے اپنے جذبات واحساسات محسوس ہوں گے۔

میں اپنے شہر میں پھرتا ہوں اجنبی کی طرح
غموں کا نقش ہوں افکار کا نشانہ ہوں
ہر ایک نقش قدم پر لہو کے چھالے تھے
ہماری راہ میں ، ایسے بھی رہگذر آئے

سعید صاحب اہل عرب ہونے کی وجہ سے اپنے آباواجداد کے فن سپہ گری سے بھی خوب واقف تھے۔اور خصوصاً تلوار زنی میں تو بہت مہارت رکھتے تھے۔ہندوستان کے مشہور نیشنل اتھلیٹک آنجہانی ابراہم مستری نے ایک نجی ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی سید صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں اور ان ہی سے انہوں نے تلوار چلانا بھی سیکھی ہے۔انہوں نے مزید کہا تھا کہ سعید صاحب اس طرح تلوار چلایا کرتے کہ ''سیب'' کو ٹیبل پر رکھ کر تلوار پھراتے ہوئے اس طرح وار کرتے کہ سیب دوٹکڑے ہوجاتا لیکن ٹیبل پر ذرابرابر بھی ضرب نہ لگتی۔اسی طرح ''درخت تناور'' پر وار کرتے کہ ''تنا'' کٹ جاتا۔تلوار آرپار ہوجاتی لیکن تنا کٹ کر نہیں گرتا۔

سعید صاحب پینٹنگ،شاعری اور فن سپہ گری کے علاوہ میوزک سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور انہیں Taal اور Raag سے اچھی طرح واقفیت تھی اور یہ خود بھی بہت ہی اچھی طرح سے ہارمونی Hum اور طلبہ Tabla بجایا کرتے تھے۔

سعید صاحب میرے خاص پھوپھی زاد بھائی تھے۔اس لئے مجھے اکثر ان کے گھر آنا جانا ہوا کرتا تھا۔ویسے تو میں (راقم الحروف) سعید بھائی سے عمر میں بہت ہی چھوٹا تھا لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے بہت ہی مشفقانہ انداز سے خلوص اور اپنائیت سے باتیں کیا کرتے اور محنت سے خوداعتادی کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین کیا کرتے وہ بہت ہی سادہ لوح منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔وہ جب تک بقید حیات رہے گھر میں ہونے والی ہر تقریب میں اہل خاندان کو بلایا کرتے اور بڑوں کا بہت ہی ادب واحترام اور چھوٹوں سے بہت ہی پیار وشفقت سے پیش آتے۔

سعید بھائی کے گھر اکثر مشاعرہ اور ساز پر غزلیات کے پروگرام بھی منعقد ہوا کرتے۔اس دور کے نامور شعراءکرام اور غزل گو شرکت کرتے۔

سعید بھائی کس قدر شفیق اور اپنائیت کے پیکر تھے اس مختصر واقعہ سے اندازہ لگالیا جاسکتا ہے جو کہ میرے ذہن وقلب پر نقش کرگیا ہے۔ایک روز کی بات ہے کہ میں اور میرے بڑے بھائی (نیر مسدوسی) گھریلو معاملات میں ان سے بات چیت کررہے تھے کہ یہ گفتگو بحث کی شکل اختیار کرگئی۔ اس بات پر بھابھی (سعید صاحب کی اہلیہ) نے ہمارے درمیان مداخلت کرتے ہوئے ہمیں خاموش ہوجانے کے لئے کہا۔تب میں نے ان سے (بھابھی) سے کہا کہ آپ ہمارے بیچ مداخلت نہ کیجئے کیوں کہ یہ ہمارے بھائیوں کا آپسی معاملہ ہے۔ یہ سن کر سعید بھائی نے فوری میری تائید کرتے ہوئے اپنی اہلیہ سے کہا نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔(آمین) مرحوم۔بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔

سعید بھائی کا 12رجنوری 1982ءکوانتقال ہوگیا۔اناللہ واناالیہ راجعون۔

☆☆☆

احمد نور عینی۔استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

کبیر داس
برہمنواد کا باغی اور محبت کا داعی

آج ۱۱ر جون (۲۰۲۵) کو کبیر جینتی منائی جارہی ہے، کبیر داس پندرہویں صدی کے ایک انقلابی شاعر، سماجی مصلح ومفکر، اور محبت کے عظیم مبلغ گذرے ہیں، اترپردیش کی جلاہا ذات سے ان کا تعلق تھا، یہ ذات ماقبل اسلام زمانے سے ہی کپڑے بننے کا کام کرتی آرہی ہے، انھیں کوری کہا جاتا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد یہ جلاہا سے متعارف ہوئے، ادھر ماضی قریب میں انصاری سے موسوم ہوئے، شیخ انصاری سے امتیاز کرنے کے لیے انھیں مومن انصاری بھی کہا جاتا ہے۔

یہ ذات اسلام قبول کرنے سے پہلے ہندو سماج میں نیچ اور کمتر سمجھی جاتی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی سماجی حیثیت میں کچھ تبدیلی تو ضرور آئی مگر یہ سچ ہے کہ انھیں برابری اور عزت وافتخار کا وہ مقام نہ مل سکا جو اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر انھیں ملنا چاہیے تھا، کبیر نے ذات پات کی تفریق کو اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھا اور اونچ نیچ کے جذبات کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا، سماج کی طبقاتی تقسیم اور ذات پات کی لعنت نیز ہندو مسلم تصادم کا حل تلاش کرنے اور انسانیت کی بنیاد پر انسانی سماج کو ایک دیکھنے کے لیے انھوں نے کافی غور وخوض کیا، انھیں ان سارے مسائل کا حل ایک لفظ 'محبت' میں ملا، اور کیوں نہ ہو کہ

ایک لفظ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

کبیر نے ذات پات اور برہمنواد پر کھل کر ہلہ بولا ہے اور جم کر حملہ کیا ہے۔ برہمنیت پر وار کرتے ہوئے انھوں نے اپنے دوہوں میں برہمن لفظ کو استعمال کرنے سے کوئی گریز نہیں کیا۔

انھوں نے انسانیت اور مساوات کی قدر کو بہت زیادہ اہمیت دی، ان کے دوہوں کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت، مساوات اور محبت کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ مذہب کی حیثیت ثانوی ہوگئی، جب کہ سچے مذہب اور ان اقدار میں کوئی تعارض نہیں ہوتا، مگر بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کبیر کے نزدیک مذہبی وابستگی میں تصلب ایک منفی قدر ہے، اس سے دو مذہب کے ماننے والوں کے بیچ دیوار اٹھتی ہے اور دراڑ پڑتی ہے، اسی وجہ سے کبیر وحدت دین کے بجائے وحدت ادیان پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ کبیر کے تصور مذہب سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، لیکن جس مقصد کے لیے انھوں نے یہ تصور اپنایا وہ مقصد یقیناً بہت اہم ہے، وہ مقصد ہے انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنا، نفرت کی

دیواریں گرانا، محبت کی شمع جلانا، ذات پات کا خاتمہ کرنا، طبقاتی نظام کو زمین بوس کرنا اور ہندو مسلم دونوں قوموں کے بیچ کی خلیج پاٹنا۔

کبیر نے پوری زندگی پریم کے دیپ جلائے، اور جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا۔ کبیر کے چراغ سے کئی چراغ جلے، سماج ان کی تعلیمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، دیکھتے ہی دیکھتے ان کا ایک 'پنتھ' بن گیا۔ کبیر کی پوری تحریک برہمنواد کے خلاف تھی، برہمنواد یہ سب ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر سکتا تھا، اس نے جب دیکھا کہ اس شخصیت کا دائرۂ اثر بڑھتا ہی جا رہا ہے اور اس کو دبانا آسان نہیں ہے تو اس نے اپنی پالیسی کے مطابق کبیر کو برہمنوادی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، اور وہ اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوا، اس نے کبیر کو برہمنوادی مفاد میں استعمال کرنے کے لیے ایک افواہ تو یہ پھیلائی کہ کبیر خود برہمنی کے شکم سے پیدا ہوئے، اور یہ چوں کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی ماں نے بدنامی کے ڈر سے انھیں تالاب کے کنارے پھینک دیا، پھر انھیں مسلم جولاہے خاندان کے ایک جوڑے نے اٹھا کر اپنی پرورش میں لیا۔ یہ پوری کہانی گھڑی ہوئی ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اس کہانی سے خود کبیر کی بے عزتی ہوتی ہے، برہمنواد نے یہ پوری کہانی یہ ثابت کرنے کے لیے گھڑی کہ کبیر نسلاً برہمن تھے، اور کبیر کے ذریعہ جو اتنا بڑا سماجی اصلاح کا انقلاب برپا ہوا وہ ایک برہمن نے ہی برپا کیا تھا۔ برہمن کے دماغ نے زیب داستاں کے لیے جو یہ بے بنیاد حکایت گھڑی ہے اس کے جواب کے لیے وہ دوہے کافی ہیں جن میں کبیر نے اپنے کو جلاہا کہا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں:

جاتی جلاہا نام کبیرا، اجھو پتیجو ناہی (گرنتھاولی:270)

ایک دوہے میں وہ برہمن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تو برہمن میں کاسی کا جلاہا، چینہ نہ مور گیانا (گرنتھاولی:250)

اگر کبیر برہمن نسل کے ہوتے تو وہ یوں کہتے کہ تو اگر برہمن ہے تو میں بھی برہمن ہوں، اور کوئی عام برہمن نہیں؛ کاشی کا برہمن ہوں، بجائے اس کے وہ کہتے ہیں کہ تو اگر برہمن ہے تو میں کاشی کا جلاہا ہوں۔

کبیر کو برہمنوادی رنگ میں رنگنے اور ان کی تعلیمات کی انقلابیت پر زد لگانے کے لیے برہمنواد نے جو دوسرا کام کیا وہ یہ کہ کبیر کو برہمن گرو رامانند کا چیلا (مرید) بتایا، اور اس کے لیے بھی ایک خوبصورت حکایت گھڑی جس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اس دعوی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ان کا یہ دوہہ پیش کیا جاتا ہے کہ "کاشی میں ہم پرکٹ بھیے، رامانند چیتائے"۔ یہ دوہہ بہت مشہور کیا گیا، اور اس بنیاد پر کبیر کے رامانند کے چیلا ہونے کی بات اتنی زیادہ چلائی گئی کہ وہ ایک حقیقیت کے طور پر قبول کر لی گئی، اور کبیر پر لکھنے یا بولنے والا یہ مان کر چلتا ہے کہ کبیر داس ویشنوی گرو رامانند کے چیلے تھے۔ جہاں تک اس دوہے کی بات ہے تو یہ دوہہ کبیر کی شاعری کے مستند مراجع میں نہیں ملتا ہے، کبیر کے دوہوں کے دو ہی مستند مراجع ہیں: ایک گرو گرنتھ صاحب، دوسرے کبیر گرنتھاولی۔ رامانند والا دوہہ ان دونوں میں نہیں ملتا۔

اور جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ کبیر نے رامانند سے رام نام لیا تھا، تو اس کے لیے پہلے یہ دیکھنا ہوگا

کہ آیا کبیر کی ملاقات رامانند سے ہوئی بھی ہے یا نہیں، ملاقات کے ثبوت پر کوئی دلیل نہیں ملتی، اگر معاصرت کو ملاقات کے امکان کے لیے کافی مان لیں تو بھی یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ رامانند کی حیات میں کبیر اس عمر کو پہنچ گئے تھے جس عمر میں نرگرو ہونے (بے پیری کے رہنے) کا احساس انسان کو بے چین رکھتا ہے اور سچے گرو کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتا ہے۔

رامانند کے سن وفات اور کبیر داس کے سن پیدائش دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، پھر بھی اگر ہم رامانند کی وفات کو کھینچ تان کر ۱۴۶۷ء تک لے کر جائیں اور کبیر داس کی پیدائش کو کھینچ تان کر ۱۴۵۶ء تک لے کر آئیں تو بھی رامانند کے انتقال کے وقت کبیر داس کی عمر ۱۱ر سال کی ہوتی ہے، اور پیری والی داستان اس عمر کو زیب نہیں دیتی۔ اور اگر ہم رامانند کی وفات کے تعلق سے دوسرے اقوال لے لیں تو ان کی وفات کبیر کی پیدائش سے قبل ہی ہو جاتی ہے۔

تاریخی پہلو کے علاوہ اگر ہم نظریاتی وفکری پہلو سے غور کریں تو دونوں کے راستے واضح طور پر جدا نظر آتے ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ رامانند ورن آشرم دھرم کو سماجی نظام میں اساسی حیثیت دیتے ہیں، جب کہ کبیر داس اس نظام کی جڑیں کھودتے ہیں، اسی طرح رامانند مورتی پوجا کا عقیدہ رکھتے ہیں، اوتار واد کو تسلیم کرتے ہیں، وید کو مقدس مانتے ہیں، ویدک دھرم کے پر جوش مبلغ ہیں، ذات واجب الوجود ہستی کو سگن اور ساکار مانتے ہیں، جب کہ کبیر مورتی پوجا کا کھنڈن کرتے ہیں، اوتار واد کا انکار کرتے ہیں، وید پر سخت تنقید کرتے ہیں، ویدک دھرم کے سخت مخالف وناقد ہیں، خدا کو نراکار مانتے ہیں۔ ہاں رام کا ذکر کبیر کے یہاں ملتا ہے، جس سے ان کا رشتہ رامانند سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس طور پر کہ رامانند ویشنوی فرقوں میں اس فرقہ کے گرو مانے جاتے ہیں جو رام کی محبت، عقیدت اور عبادت پر زیادہ زور دیتا ہے، مگر غور کرنے پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کبیر کے رام اور رامانند کے رام میں فرق ہے، کبیر کا رام نرگن نراکار ہستی ہے، جب کہ رامانند کا رام سگن برہم وشنو دیوتا کا اوتار ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسا چیلا ہے جو اپنے گرو کے راستے کو نہ اپنا سکا اور یہ کیسا گرو ہے جو اپنے چیلے کو اپنے راستے پر نہ لگا سکا۔ یہاں اس بات کا ذکر بے فائدہ نہ ہوگا کہ کبیر کو رامانند کا چیلا بتانے سے برہمنواد کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھکتی تحریک کا بہ آسانی برہمنی کرن کر دیا گیا۔

بھکتی تحریک ذات پات اور انسانی عدم مساوات کے خلاف شروع ہوئی تھی، وہ صوفی تحریک سے واضح طور پر متاثر تھی، اور صوفی تحریک اسلامی تعلیمات کا نتیجہ تھی، یعنی بھکتی تحریک اس ملک میں اسلام کی آمد سے پیدا ہونی والی ایک مثبت تبدیلی تھی، یہ اگر کامیاب ہو جاتی تو صوفی تحریک کی لگائی کھیتی لہلہا اٹھتی اور برہمنواد کا نشیمن بلکہ سارا گلشن خاکستر ہو جاتا، اس لیے اس کو بے اثر کیے بغیر برہمنواد چین کی نیند نہیں سو سکتا تھا، بے اثر کرنے کے لیے اس نے جو حربہ اپنایا وہ یہ کہ اس نے بھکتی تحریک کے سنتوں کو برہمن گروؤں کا مرید بنا دیا، اور ان کے فرمودات میں برہمنی دیوی دیوتا اور سناتنی معتقدات گھسا دیے، یوں جس تحریک کے سہارے شودر اور اتی شودر سماج سے آنے والے سنتوں نے دبے کچلے مولنواسی سماج کو برہمنواد سے آزادی کے لیے بیدار کیا اس تحریک کو برہمنواد نے سنتوں کے برہمن کرن کے ذریعہ اپنی

علی شاہدؔ دلکش۔مغربی بنگال، بھارت

عید مبارک

کہتی ہے محبت کی ہوا عید مبارک
لو آ گئی فرحت کی فضا عید مبارک
انعام خدا سے سبھی صائم کو ملے گا
پیغام یہ لے آئی صبا عید مبارک
شکوے گِلے سب بھول کے مِل جائیں گلے ہم
کہتی ہے محبت کی رِدا عید مبارک
جب چاند نظر عید کا آتا ہے کسی شہر
ہر شہر سے آتی ہے ندا عید مبارک
دل جھوم اُٹھا پیار سے جب یار نے آ کر
شرما کے کہا جانِ وفا عید مبارک
روٹھے بھی کئی بار گلے تجھ سے ملیں گے
اِک بار انھیں کہہ دیں ذرا عید مبارک
الفت نے یہ نفرت سے کہا عید کے دن چل
نفرت کی یہ یوار گرا عید مبارک
نفرت نے بھی الفت سے کہا عید کے دن یہ
دیوار محبت کی اُٹھا عید مبارک
جب یاد فلسطیں پہ ستم آتے ہیں شاہدؔ
من کہتا ہے مت شور مچا عید مبارک

گود میں تھپکی دے کر سلا دیا۔

خزینۃ الاصفیاء میں کبیر کے بارے میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ وہ شیخ علی متقی کے مرید تھے، (دیکھیے محولہ کتاب: ۱/۴۴۶)۔ یہ بات مشہور تو ہے مگر اس کی استنادی حیثیت کیا ہے اس بابت قبل از تحقیق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔کبیر کے مسلم سماج سے ہونے بلکہ موحد ہونے میں کوئی شک نہیں، البتہ یہ بات محتاج تحقیق ہے کہ کیا ان کا عقیدۂ توحید عین اسلامی عقیدۂ توحید ہی تھا یا اس سے کچھ مختلف تھا۔

اسی طرح کیا کبیر دیگر اسلامی عقائد کو بھی اسی طرح مانتے تھے جس طرح انھیں ماننے کا حکم ہے یا ان کی ایمانیات کچھ الگ تھیں۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کبیر کو ملحد یا گمراہ مان لیا جائے، وہ چوں کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے جب تک ان کے مسلمان نہ ہونے کی یا غیر اسلامی عقائد کے حامل ہونے کی کوئی تحقیق کے ساتھ ثابت نہیں ہو جاتی تب تک ان کی تکفیر یا تضلیل سے احتراز کیا جانا چاہیے۔ہاں ان کی طرف جو کلام منسوب ہے اس میں اگر کوئی بات خلاف اسلام ملتی ہے تو اس بات پر نکیر ضرور کی جانی چاہیے۔

کبیر داس کی زندگی اتر پردیش کے کاشی (بنارس) اور مگہر میں گذری، ان کا مزار مگہر (ضلع سنت کبیر نگر) میں آمی ندی کے کنارے واقع ہے، مزار کے بازو میں ہی ان کی سمادھی بھی بنی ہوئی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مختار احمد فردین ۔صدر آل انڈیا اُردو ماس سوسائٹی فار پیس

بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد

قوم وملت کے لئے فکرمند تھے، پھر پیدا نہ ہوسکے ایسے آزاد

آزادی کے بعد مسلمانوں پر جانے کیا کیا الزام تراشی کی گئی 'مسلمانوں نے جنگ آزادی کی بنیاد ڈالی اور جب آزادی ہاتھ آیا تو پھر مسلمانوں سے اور مسلمانوں پر ہی آزادی کے وہ تمام حقوق جس پر ان کا بنیادی حق تھا تنگ کر دیا گیا اور جو حالات آزادی کے بعد دیکھے گئے اس کا خمیازہ آج بھی بھگت رہے ہیں مسلمان آج کے سیاسی تجزیے میں گاندھی جی کے مشورہ مسلمانوں کے لئے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی پریشانی کا سبب ڈھونڈے' آزادی کی کسوٹی نے ہمیں کس کس مقام سے لاکر آج کہاں کھڑا کر دیا۔آپ آزادی بلند کا اور جمہوریت کے علمبردار ہیں اس پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ دوسروں کا' پھر آج بھی ہم پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں آج بھی ہمیں شکوک کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔آپ سیاسی قائد کی ملت کے لئے اہم ضرورت ہے آخر اس کی نمائندگی کون کرے' کب تک ہم اس جماعت اُس جماعت کا سہارا لے کر خود کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ہم کب تک سیاسی مطالبہ کے ذریعہ اپنی آزادی کا وہ حق جو مجھے آج تک حاصل نہ ہو سکا' آخر کب ملے گا کب ہمارے لوگ اس سنجیدہ مسئلہ پر فکر کرنے کے لئے متحد ہو جائیں گے۔اس فکر کو گاندھی جی اور مولانا آزاد کی حق گوئی میں تلاش کریں۔

گاندھی جی بے شک ایک فراخدل انسان اور سیاسی سوچ وفکر میں مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا پسند کرتے تھے۔گاندھی جی ۲۳ رجنوری کو شام (بحوالہ الجمعیۃ ۱۹۴۷ء) اپنی پرارتھنا کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ جب تک کانگریس میں فراخدلی اور مساوی بنیاد پر ان کا استقبال نہ کیا جائے انہیں اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔گاندھی جی نے کہا کہ ہندوستان میں مسلمان اپنے آپ کو اقلیت محسوس کرتے ہیں لیکن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔آپ نے کہا کہ عدم تشدد کا طریقہ موجود ہے جس کا گزشتہ 30 رسال سے تجربہ کیا جا چکا ہے۔اور اس طریقہ سے وہ ہر اس چیز کی جو اپنی عزیز ہے حفاظت کرسکتی ہے۔انسان اگر خود کو اپنے خالق کو پہچانے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے تکریم خودی سے نہیں روک سکتی۔

گاندھی جی نے یہاں ذخر کی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سے صرف آٹھ میل کے فاصلے پر خواجہ قطب الدین کاکی کا مزار ہے جو تقدس میں اجمار خانقاہ سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا ہے' ان دونوں خانقاہوں پر نہ صرف مسلمان بلکہ ہزاروں ہندو اور غیر ہندو جاتے ہیں اور عقیدت رکھتے ہیں۔گزشتہ ستمبر میں ہندوؤں کا غضب اس مقدس مقام پر بھی نازل ہوا۔اس جگہ کے مسلمانوں نے خود کو نکل جانے کے لئے مجبور پایا جو ان کے نزدیک صدیوں سے متبرک ومحترم تھی ۔پس اس غم آخریں واقعہ کا ذکر نہ کرتا لیکن اس وجہ سے کہا کہ مسلمان اس خانقاہ سے عقیدت رکھنے کے باوجود اب تک وہاں نہیں پہنچے ۔تمام ہندوؤں' سکھوں اور متعلقہ افسروں کی ذمہ داری اور ضروری فرض ہے کہ اس دھبہ کو مٹا دیں اور خانقاہ مذکور کی قدیم شان بحال کر دیں' اور ایسا ہی مسلمانوں کے دوسرے متبرک مقامات کے ساتھ کیا جائے۔اگر گاندھی جی زندہ ہوتے تو پھر کیا

گجرات کا المیہ اور بابری مسجد کی شہادت دیکھنے کو ملتی ،نریندر مودی اگر گاندھی جی کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہوتے تو کیا گجرات دہکتا یا پھر کسی ماں کی کو بچہ کو چیر کاٹنے کا ننگا ناچ' مگر ہم آزاد ہیں اور آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی ہندوستان جو مسلمانوں کے ساتھ یہی رویہ جس سے کے ہماری معاشی اور تعلیمی پسماندگی اور غریبی اور سطح غربت کی زندگی میرے جیسے کی زینت بنے اب آپ دیکھی مولانا آزاد کس قدر فکر مند تھے مسلمانوں کی پریشانی کو لے کر مولانا ابوالکلام آزاد جنہوں نے ملک کی آزادی میں گاندھی جی کے ساتھ ہر ہملے مسلمانوں کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی پر خوف اور ڈر جانے اور انجانے طور سے دونوں جنگ آزادی کے ہیرو دلوں میں ہو تو تا کہ آزادی کے بعد ضرور ایک ایسا ڈرامہ اسٹیج ہوگا جس پر ہر کوئی اپنا زیادہ سے زیادہ حق مانگنے کی کوشش میں سچے سپاہی اور وفادار ساتھی کو چھوڑ دے گا۔ یہاں ایک خاص ذکر بحوالہ الانصاف 5 / مارچ 49ء) ۲۸ / جنوری کو کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں سے فرمایا 'ہمیشہ یاد رکھئے کہ آپ بلند یونین کے باشندے ہیں اور اس لحاظ سے آپ ہندوستانی ہیں خواہ آپ کے مذہبی اعتقادات کچھ ہی کیوں نہ ہوں' گورنمنٹ پر اعتماد رکھئے ہر حکومت آپ کی اتنی ہی ہے جتنی ہندوؤں کی' آپ ہند یونین سے غیر مشروط وفاداری کیجئے پھر آپ کو پریشانی اور پشیمانی کا کوئی موقع نہ ہوگا۔

مولانا نے اپنے اس ذکر میں مسلمانوں کے سامنے پریشانی اور پشیمانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے چار اہم باتوں کو پیش کیا ہے یعنی ☆ اپنے ہندوستانی ہونے کو ہمیشہ یاد رکھنا ☆ حکومت پر کلی اعتماد/ حکومت کو خود کا سمجھنا اور ☆ حکومت کی غیر مشروط وفاداری' جہاں تک ہم نے غور کیا مندرجہ بالا تجویز کے پہلے اور آخری حصے پر مسلمان ہندوؤں سے کسی طرح کم عملی پیرا نہیں ہیں اور دوسرے اور تیسرے حصے کے تعلق سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی نصیحت کے مطابق مسلمانوں میں حکومت پر اعتماد کر رہے ہیں اور اسے اپنی حکومت بھی سمجھنے لگے ہیں اگر نہیں سمجھیں گے تو اس کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی پریشانی اور پشیمانی میں کوئی خاص کمی واقع نظر نہیں آتی اگر اس کا سبب یہ ڈھونڈیں یا قرار دیا جائے کہ تجویز کے حصہ دوم وسوم پر مسلمان ابھی پوری طرح عمل پیرا نہیں ہیں تو مسلمانوں کی پریشانی اور پشیمانی میں کوئی خاص کمی واقع نظر نہیں آتی اگر اس کا سبب یہ ڈھونڈیں یا قرار دیا جائے کہ تجویز کے حصہ دوم وسوم پر مسلمان ابھی پوری طرح عمل پیرا نہیں ہیں تو مسلمانوں کی پریشانی اور پشیمانی کی اصل وجہ ہمیشہ ہی تھی اور آج بھی یہی ہے کہ اپنے فرض منصبی سے غافل ہو گئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ دنیا کو خدا کی حاکمیت اور اس غیر مشروط اطاعت و فاداری کا سبق سکھاتے اور اپنے قول وعمل سے جس کی مکمل گواہی دیتے ۔مگر انہوں نے اپنے فرض کو بھلا کر دنیا پرستی کی دوڑ میں دیگر اقوال عالم کے ساتھ مسابقت شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ پشیمانی اور پریشانی کا شکار ہو کر آ گئے۔ آج ہندوستان ہی کے دنیائے تمام ملک کے مسلمان اسی جرم وعلم پاداش میں پریشان و پشیمان ہیں۔

اس دو اہم ترین شخصیت کے باتوں کا تجزیہ کریں اور آزادی کے بعد یہ ملک ہندوستان کو دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی کہ ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ ہمیشہ ہی ڈھائے گئے جن سبھوں کی کوششوں کا نتیجہ اور آزادی حاصل ہوتی۔ اس لہولہان ہونے میں مادر وطن کے ساتھ مرمٹ جانے والوں میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ مگر آج بھی ہم پر آزادی کے بعد بھی وہی نا انصافی' وہی وستم وہی تمام شکوے جو کہ کل تھا اور آج ہے اس لئے آج ہم مسلمانوں میں ایک سیاسی قوت بن کر ابھرنے کے لئے ایک ایسی جماعت بنانے کی فکر یہ ایک دانشور'' مفکر' سیاسی اور علماء دین' ہندوستان کی آبادی ۲۵ تا ۳۰ کروڑ سے زائد مسلمان کے لئے یہ لمحہ فکر ہے کہ ہم اپنی قیادت کے لئے قومی سطح پر سچے ایماندار رہبر کی تلاش کریں یہ کام گرچہ مشکل ہوگا مگر ناممکن تو نہیں۔ کیونکہ مولانا آزاد اور گاندھی جی بھی چھ اس طرح سے ہی فکر مند تھے۔

مولانا آزاد نے اپنی حیات میں ملک وقوم کے نام یہ پیام

دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ مدتوں بعد میرے تیس صفحات کا مطالعہ کریں۔ اس تیس صفحات میں مولانا کو آنے والے دنوں میں سیاسی اتھل پتھل، اتار چڑھاؤ کا بہت اندازہ تھا اور انہیں یہ فکر بہت ستانے لگی تھی کہ آزادی کے فوری بعد جو کچھ بھی حالات اس ملک میں پیدا ہوئے آنے والے دنوں میں نا جانے کیا کچھ ہوگا اس فکر کے تحت انہوں نے اپنی دوراندیشی کو قلمبند کیا اور محفوظ کر دیئے، آیئے ان ہی تیس صفحات کو جس پر بہت کچھ ہنگامہ ہے آج اپنی فکر کو مولانا آزاد کی فکر سے ایک جائزہ لیتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔

30 صفحات............

22 نومبر 1988 ہندوستان کے لئے ایک اہم ترین دن تصور کیا جاتا تھا۔ ابھی بھی اس دن کی اہمیت باقی ہے۔ آج پورے ملک کے لئے موضوع بحث مولانا آزاد کی وہ 30 صفات، جو کسی بھی وجہ کر انڈیا ونز فریڈم میں شامل کیا جا سکا۔ اس کی وجہ مولانا آزاد کی دوراندیشی اور ہمایوں کبیر کی ہوشمندی یا پھر اُس وقت کے حالات نے اس بات کا اجازت نہیں دی تھی کہ کچھ نازک تلخ حقیقت جس کو ملا نے ہمایوں کبیر کے مشورہ پر قلمبند کیا تھا۔ India Wins Freedom میں شامل نہیں کیا گیا۔ انڈیا ونز فریڈم جس کس نے بھی مطالعہ کیا۔ اس بات کی آگاہی ضروری ہوگی کہ مولانا ابھی اور کچھ کہنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 30 صفات کے بغیر ہی اس کی اشاعت عمل میں لائی۔ جو اس کتاب کے نامکمل ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

مولانا آزاد کے 30 صفات جو حفاظتی لاکر میں بند ہے۔ اب کھولنے میں قانونی پیچیدگیاں جو پیدا کی جارہی ہیں اس کے پس پردہ کوئی تو ایسی بات ہے جس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اب تک بہت سی قیاس آرائیاں کی جاچکی ہیں کہ ''مولانا نے اپنے بقیہ 30 صفات میں بٹوارے کی مخالفت کی اور کسی بھی قیمت پر Partition کے حق میں نہیں تھے۔ اس 30 صفاف میں کیا مولانا نے گاندھی جی، نہرو، پٹیل پر کچھ لکھنے کی جرأت کی؟ مولانا بلند پائے کے بزرگ، سیاستداں اور ماہر قانون اور دوراندیش تھے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی، مولانا آزاد کے فارمولے کو قبول کیا تھا۔ مگر نہرو، پٹیل نے اپنی مفاد کی خاطر اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور آزاد ہندوستان، دوسری جانب جناح جو مولانا آزاد کے ہر ایک پیش کش سے اتفاق رکھتے تھے 'ایسے پوزیشن پر مولانا کھڑے تھے کے جناح نے آواز بلند کیا اب اس ملک کو بٹوارے کو کوئی روک سکتا اور نتیجتاً ہندوستان دو حصہ میں بٹ گیا۔ مولانا اس تکلیف کو جھیل میں نہیں پائے۔ اس وقت مولانا آزاد کی کیا کیفیت رہی ہوگی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مولانا آزاد نے قوم و ملک کے واسطے ہر ایک سے اپیل کی کہ اس آزادی کو جس خون سے سینچا گیا آج اتنی آسانی سے کیسے ملک کا بٹوارا ہو جائیگا۔ گاندھی جی بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو بے بس بتایا کہ میں خود نہیں چاہتا............ مگر نہرو اور سردار پٹیل ایسا چاہتے تو ہم کیا کریں، آپ مولانا یہاں کے مسلمانوں کو روکیں یہ ملک ہر اس شخص کا ہے جس نے وطن کیلئے اپنی جانیں نچھاور کی۔'' مولانا نے اپنی تقریر میں ملک و قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ تم اتنی آسانی سے قربانی کو بھول جاؤ گے۔ اپنی ملک و عزت کی بقا کو یاد کرو، جس ملک میں تمہاری اپنی حکمرانی، تہذیب رہی ہو، اس ملک کو الوداع کہتے ہوئے دکھ نہیں ہو رہا۔ جبکہ میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ گاندھی مجبور تھے اور پھر یہ کہتے پھرتے اس ملک کی آزادی میں ہندو، مسلم، سکھ، ہر ایک کی قربانی ہے جس آزادی کی خاطر اپنی جانیں دیکر حاصل کی اگر الگ ہو گئے تو پھر آزادی کے کیا مفہوم رہ جائیں گے۔

ہم کسی دوسرے نقطہ نگاہ سے سوچیں تو دیکھا جائیگا کہ مولانا نے نہرو جی، گاندھی جی، پٹیل، جناح وغیرہ پر سچی حقائق کے ساتھ ساتھ قوم کی نااہلی پر بھی آنسو بہایا ہوگا۔ اگر چہ پٹیل اور دیگر نے فرقہ پرستی کی جڑیں کو مضبوط کر چکے تھے اور یہ ایک اب بیج بویا گیا جو آج بھی ہندو، مسلمان جھیل رہے ہیں۔ مولانا نے اس وقت

قوم کی قیادت قبول کی اور پورے باوقار طریقے سے اپنی قوم کو آزاد ہندوستان میں رہنے کی جگہ فراہم کر دیا۔ ایمانداری اور خلوص سے ملک وقوم کی خدمت کی اسی بنا پر مولانا کو آج بھی بلند ترین مقام حاصل ہے۔ مولانا کا دل اس قدر مجروح ہوئے ملک کے بٹوارے سے وہ اس بات کو قلمبند کر کے رکھنا نہیں چاہتے تھے ۔مگر ہمایوں کبیر جیسے Intelectual جو ایک خاص ساتھی اور مشیر خاص مانے جاتے تھے انہوں نے حالات کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے پوری کتاب ترتیب دی۔ جس میں ہمایوں کبیر کی پوری سچی کوشش تھی اور 30 صفحات کو انڈیا ونز فریڈم میں سے نکال دیا۔مگر آج ملک گیر سطح پر ہر کوئی دانشور وخاص وعام کیلئے لمحہ فکر ہے کہ مولانا آزاد کو اگر اس بات کا علم ہو جاتا کہ آزادی کے نام پر آزادی حاصل کرنے کے لئے شطرنج کی یہ جال (مفاد پرست لیڈران) جو بچھایا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔مگر میری حقیقت تیس صفحات ان لوگوں کے کچے چٹھے کھول کر رکھ دے گا۔کملا ترپاٹھی' راجیو گاندھی اور باقی تمام لیڈران آزادی وقت اس فکر میں ڈوب گئے۔ کے مولانا آزاد کے 30 صفحات کیا کیا راز فاش کرینگے۔جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

نجمہ ہبت اللہ نے ایک گوشہ نکالیں کہ ''مولانا نے ایسی بات اپنی کسی ڈائری میں درج ہی نہیں کیا اور نہ ہی کسی 30 صفحات کو وہ ترتیب دئے ۔ یہاں نجمہ ہبت اللہ نے بھی جو خاندان کی ایک فرد ہیں' خود مولانا کی شخصیت کا صحیح جائزہ نہیں لے پئیں ۔آج جو بھی مقام نجمہ ہبت اللہ کو حاصل ہے وہ ایک طرح سے مولانا کے خدمات کا صلہ ہے جو نجمہ ہبت اللہ کے حصہ میں ہے۔مولانا نے پوری ایمانداری سے کوشش کی تھی کہ مسلم رہنما کبھی کسی کے دباؤ میں نہ رہے اپنے اندر تمام خوبی اس قدر پیدا کریں عوام خود اُسے لیڈر تصور کریں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کی دختر لیلیٰ کبیر نے اپنی سچی کوشش اور محنت کا ثبوت دیا کہ باقی کے 30 صفحات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن تعاون کر رہی ہیں ۔کیونکہ مولانا کا یہ سرمایہ ملک وقوم کی ملکیت ہے۔مولانا آزاد کو نہرو جی کیا اس وقت آزادی کی سبھی سورما عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔نہرو ہر وقت اپنے قریب رکھا۔مگر اس کے معنی یہ نہیں کے نہرو کی خامی مولانا اجاگر نہ کریں۔نہرو خاندان کی قربانی سے مولانا انکار نہیں کیا۔مگر ان لوگوں کی صرف قربانی آزادی کی راہ ہموار نہیں کر سکتا۔بلکہ شہیدان وطن کی قربانی رنگ لائی اور پھر ہم آزاد ہوئے۔' آج یہ کہنا کے مولانا نے اگر نہرو خاندان پر حقیقت کا راز کھولا تو پورا ملک مولانا کو اچھی صفت مجاہد آزادی تصور نہیں کریں گے۔اس سے کسی انسان کی صفت ہی کمی نہیں آتی۔مولانا ایک ایسے حساس دل ودماغ کے مالک تھے کے ان کو آنے والے کل کی آگاہی بخوبی تھی۔مولانا نے اپنے تیس صفحات میں کچھ بھی درج کیا ہو۔تمام تر چیز ہی اہمیت کا حامل ہوگی ۔فوراً کوئی بھی محبان وطن مولانا آزاد کے قلم کے زد میں آئے۔ مولانا ایک سیکولر جمہوری مزاج رکھنے والے وہ شخص ہے جس کا قرض آج نہ تو ہندو مسلمان ادا کر سکتے اور نہ ہی پورے ملک کے لوگ ادا کر سکتے ہیں۔مولانا آزادی کا ایک اہم ستون تھے جس کے بغیر آزادی کا ذکر نامکمل ہیں۔

اب عام لوگوں کے اندر ایک ہیجانی کیفیت پائی جارہی ہے ''کیا مولانا کے 30 صفحات جوں کا توں ہوگا' کہیں مولانا کے ان صفحات کی حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا جائے گا جس سے جنگ آزادی کے رہنما مولانا کے دامن پر کوئی داغ لگ جائے۔اگر ایسا ہوا تو یہ بھی ایک سازش ہوگی۔اس 30 صفحات کو ہائی کورٹ میں لاکر قانونی پیچیدگیاں پیدا کی جارہی ہیں تاکہ یہ صفحات کھولے ہی نہ جائیں ۔عوام کو چاہئے کہ مولانا آزاد اور ہمایوں کبیر کی اس کوشش ......کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر عوام کے سامنے کھولا جائے۔مولانا کا ممکن ہے کہ آج کے درپیش پیچیدہ مسائل کا ذکر ہو' جو ایک نئی راہ ہموار کر سکے' کچھ بھی ہو مولانا نے اپنے ملک وقوم کے لئے لکھا' ہمیشہ فلائی بہبود کیلئے' سونچ وفکر میں ڈوب کر لکھا کرتے تھے۔اس لئے مولانا کے اس 30 صفحات کے ذریعت لوگوں کو کھلے ذہن سے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد

SHIBLI INTERNATIONAL

EDUCATIONAL & CHARITABLE TRUST

Regd. No. 180/2016

مدرسہ ومسجد کے تعاون کی اپیل

حدیث نبوی ﷺ ہے خَیرُکُم مَن تَعَلَّمَ القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشرواشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** ۱۵/جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے نونہالان زیورعلم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔

الحمدللہ مدرسہ میں تعمیری کام بھی جاری ہے،اس وجہ سے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ مدرسہ کا نقد یا اشیاء کے ذریعہ تعاون فرماکر یا کسی طالب علم کی کفالت لیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

مسجد الٰہی

زیرانتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام جاری ہے۔الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیرّہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے، اللہ تعالیٰ مخیرّہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجد الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی وغیر اقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیرانتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے،اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کے تعمیری کام میں نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کرکے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جزاك الله خيرًا أحسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number** : 1327104000065876

A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar

G Pay & Phone Pay : 8317692718, WhatsApp: 9392533661

العارض: حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

March 2025

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216
Rs. 20/-

ABDUL WAHED
PROPRIETOR
Cell: 98480 36940

For Orders : 90302 02018
86396 32178
89197 03547

KGN XLNT TEA
Rich Aroma, Refreshing Taste
• PREMIUM QUALITY TEA

KGN TEA SALES

UMBRELLA BRAND TEA
Rich Aroma, Refreshing Taste
• GOLDEN QUALITY TEA

WHOLESALE & RETAIL TEA MERCHANT

S.No.: 22-1-114, Jambagh, Kali Khabar Main Road, Dar-ul-shifa, Hyderabad - 500 024, TS
Off.: 5-3-989, 104, First Floor, Sherza Estates, N.S. Road, M.J. Market, Hyderabad - 500 095
email: kgnteasales@gmail.com

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com